جوگندر پال

کے

منتخب افسانے

جوگندر پال

کے

منتخب افسانے

مرتبہ:

نریندر ناتھ سوز

سیمانت پرکاشن، نئی دہلی۔۲

قیمت : ساٹھ روپے -/۶۰
سنِ اشاعت : ۱۹۸۷ء
تعداد : ایک ہزار
خوشنویس : صداقت علی خاں
سرورق : فضیلت
طباعت : لکشمی پریس، نئی دہلی ۲

ناشر : نریندر ناتھ سوز
سیمانت پرکاشن
۹۲۲، کوچہ روہیلا، تیراہا بہرام
دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

JOGINDER PAUL KE MUNTKHIB AFSANE

Compiled by: NARINDER NATH "SOZ"

SELECTED STORIES Rs.60.00

1987


SEEMANT PRAKASHAN
922, KUCHA ROHELLA KHAN
DARYAGANJ, NEW DELHI-110002

فہرست

تیرا ہی تیرا

عرضِ مرتب

۔اہم تر تخلیقی مصنفین کی تحریروں کا انتخاب پیش کرتے ہوئے عام طور پر یہ مسئلہ درپیش نہیں
ہوتا کہ اُن کی بہتر تخلیقات کو اس میں شامل کیا جا سکے۔ مسئلہ یہ پیش آتا ہے کہ انتخاب اُن کی بھرپور نمائندگی
کر پائے۔ اس اعتبار سے جوگندر پال کا افسانوی فن اس قدر متنوع ہے کہ اس کا احاطہ کر پانا میرے
اپنے محدود کے پیش نظر واقعی مشکل معلوم ہونے لگا۔ بہرحال مجھ سے جیسے بھی بن پایا ہے۔ میں نے
یہ کام بڑی محنت اور لگن سے انجام دیا ہے۔ اور جوگندر پال کی اکیاون کہانیاں اس انتخاب میں
...توں افسانوی مجموعے سامنے رکھ کر چنی گئی ہیں۔ اُن کے
...ضمن کہانیاں مختلف رسائل میں چھپ چکی ہیں تاہم میں نے
...سے ہی منتخب کی ہیں۔ "بے ارادہ" کے بعد کی کہانیوں
مدد کر رہا ہوں۔ یہ
ی مجموعہ "بے ارا
نیاں اُن
نام سے شائع ہو رہی ہے۔
یقین کرتا ہوں کہ ادب کے بارون
نے" پیش کرتے ہو
گے۔

"ناتمام" اس لئے کہ مجھے اپنی اس سیریز میں چند اور اہم تخلیق کاروں کی منتخب تخلیقات کو پیش کرنا ہے۔

نریندر ناتھ سوز

ڈی۔۲۳۴ سروجنی نگر
نئی دھلی۔۱۱۰۰۲۳

بلیک لین

لال پگڑی والے نے مجھے روک لیا ہے۔

کہاں جا رہے ہو؟

میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اُسے کیا بتاؤں۔

جاؤ، خبردار، جو اِدھر اُدھر آنکھ اُٹھائی۔ ناک کی سیدھ میں چلتے جاؤ۔

چلو، چھٹی ہوئی۔ یہ لوگ نامعلوم کیوں مجھے روک روک کر خبردار کرتے رہتے ہیں میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔ ہمیشہ اپنی ناک کی سیدھ میں چلتا ہوں۔ کوئی کسی طرف بھی منہ کرے، چلنا تو اسے اسی طرف ہوتا ہے۔ جدھر اُس کی ناک منہ کیے ہو۔ موٹی سی بات ہے۔ پر غریب بے چارہ بولے تو کیا بولے؟ میں سر ہلا ہلا کر گویا لال پگڑی والے کو بار بار سلام کرتے ہوئے ناک کی سیدھ میں چل رہا ہوں اور شرمندہ ہوں کہ کچھ نہ کرنے پر بھی پکڑا گیا ہوں

ٹھہرو!

اُس کی آواز پر میرے پیر چلتے چلتے میری مرضی یا نا مرضی کے بغیر ایک دم ٹھہر گئے ہیں۔ میں ہوں کیا، جو اپنی مرضی سے رکوں یا چلوں!

... تیزی سے میرے قریب آکر پوچھا ہے ——— اِس جھولے میں کیا ہے؟

... جھولا بنا کر دائیں کندھے سے لٹکا لیتا ہوں۔

... رہا ہے۔ آنا پڑے تو بنا ہی رہنا چاہیے کر دل چھوٹ کر کھال

کے باہر نہ آنے لگے۔

بولتے کیوں نہیں ؟ جھولے میں کیا چھپا رکھا ہے ؟

لال پگڑی والے نے جھپٹ کر جھولے کو تیز تیز ٹٹولا ہے اور پھر منہ لٹکا کر گویا ہوا ہے، یہ تو خالی ہے۔

اس کا منہ غصے سے پھول کر پچکا پرانا فٹ بال سا بنا ہوا ہے، منتو کباڑیئے کے پاس لے جاؤں تو اس حالت میں بھی چونی دے ہی دے گا ـــــ خوفزدہ ہونے کے باوجود میں شاید ہلکا سا مسکرا دیا ہوں۔

ہنس کیوں رہے ہو ! مجھے بے وقوف سمجھتے ہو !

میں نے 'نہیں' کہنے کے لیے بڑے ادب سے سر ہلایا ہے مگر کسی بے وقوف کو جھوٹ موٹ یقین دلایا جائے کہ وہ بے وقوف نہیں تو اُسے اپنی بے وقوفی پر اور غصہ آنے لگتا ہے۔

تم بدمعاشوں کو میں خوب جانتا ہوں۔ خالی جھولا لٹکائے موقع کی تاک میں گھومتے پھرتے ہو۔

یہ بات اس کی جھوٹی نہیں مگر سبھی لوگ یہی تو کرتے ہیں۔ ہر ایک اپنے دل میں جھولا لٹکائے اسی تاک میں مارے مارے پھرتا رہتا ہے کیا معلوم کب کیا ہاتھ آجائے۔

بھاگ جاؤ، ورنہ خون پی جاؤں گا

میں یہ سوچتے ہوئے آگے ہو لیا ہوں کہ ہزار غصے کے باوجود جنگلی جانور بھی پیتے تو پانی ہی پیتے ہیں، پھر آدمی کیوں اپنا پارہ چڑھتے ہی آدمی کے لہو کا پیاسا ہو جاتا ہے ؟ ـــــ آج سویرے کی بات ہے کہ کھانے کے لیے روٹی کی پوٹلی کھول کر میں نے جو ذرا پیٹھ موڑی تو فقیرے نے روٹی پر جھپٹا مار کر اسے منہ میں لے لیا اور بھاگ نکلا ـــــ فقیرا میرا کتا ہے جو میری غیر حاضری میں میری جھونپڑی کی رکھوالی کرتا ہے ـــــ اس کے پیچھے میں نے گالیوں کی پوری فوج چھوڑ دی مگر وہ سب سے بچ کر صاف نکل گیا۔ بتانے میں یہ جا رہا ہوں کہ فقیرے کو گالیاں بکتے ہوئے میری زبان دانتوں میں آ کر کٹ گئی اور لہولہان ہو گئی اور ـــــ پتہ نہیں بھوک لگی ہوئی تھی یا کیا ؟ لہو کا ذائقہ مجھے بڑا اچھا لگا اور میں کافی دیر انجانے میں اپنا لہو بڑے مزے سے حلق سے اتارتا رہا۔ اپنی خوراک کا بندوبست اگر اپنے ہی بدن میں سے ہوتا رہے تو سارے جھنجھٹ سے، چھٹکارہ ہو جائے ـــــ

اپنے خیال کی رو میں میں یہاں کوٹھیوں کے آگے سڑک پر آ گیا ہوں۔ میرا یہاں کیا کام ہے ! سڑک کی دونوں طرف پالش کئے ہوئے پتھر کی خوب صورت کوٹھیاں ہیں اور ان کے آگے چار ایک فٹ کی باہری دیواروں تک پتھریلی کے فرش پر باغیچے لگے ہوئے ہیں جن کے رنگ برنگے پھولوں نے دیواروں سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا ہے اور پھر آپس میں سرگوشیاں کر کے ہنسنے لگے ہیں۔

میں نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا ہے۔

میرے پیروں کے نیچے سڑک اتنی صاف ہے کہ اس پر چلتے ہوئے اپنا بدن مجھے دھبہ سا لگا ہے ـــــ ہاں، اتنے صاف ستھرے آس پاس میں میرا کیا کام ! ایک میں ہی میں یہاں اس قدر گندا معلوم ہو رہا ہوں مانو کسی

کوٹھی والے نے اپنا کوڑا کرکٹ کوٹھی کی پچھلی گلی کی بجائے آگے کی طرف پھینک دیا ہو۔ منّو کباڑیئے سے میں نے کئی بار کہا ہے، ایکا ڑکم ہے تو مجھے بھی اس میں ڈال کر لے لو، پر دام پورے دو، مگر منّو مجھے صاف جواب دیتا ہے، دام تو چیز کے ہوتے ہیں، تم کس کام کے ؟ سو میں ان کوٹھیوں کی پچھلی گلیوں میں ان کے ڈھیروں گند میں سے اُس کے کام کی چیزیں چُن چُن کر اپنا جھولا بھرتا رہتا ہوں۔

میں پچھلی گلی میں داخل ہو [illegible] گھستے ہی میرے دم پیدا ہونے لگا ہے۔ ان [illegible] جاؤں۔

پچھلے ہفتے اسی کیفیت میں میری ہنسی تھمنے میں نہ آرہی تھی کہ ایک مرغ۔ وہ — ہاں، وہی ہے — وہ مرغ اپنی مرغی کے پیچھے بھاگتے ہوئے اچانک اچھل کر میرے کندھے پر آبیٹھا اور سانس کے سارے در کھول کر بانگ دینے لگا۔ اور مجھے لگا کہ اس پھرپھراتی بانگ کے پروں تلے میں انڈے کا انڈا اپنے آپ پھوٹ گیا ہوں اور اندھیرے سے باہر آکر اجالے کی جل تھل میں نہانے لگا ہوں۔

بابو کتا بھی میرے پیچھے پیچھے گلی میں آپہنچا ہے۔ بابو کو اس کا نام میرا ہی دیا ہوا ہے۔ اور کچھ دینے کو میرے پاس ہے ہی کیا ؟ یہاں کے نوکروں اور کتّوں کو بابو کہہ کے بلاتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ ایک بار چار نمبر والوں کے نوکر کا منہ اپنے گھر والوں کی گالیاں کھا کھا کے پھولا ہوا تھا کہ میں نے بڑے پیار سے اُس سے کہا، دوائی کے دام نہ ہوں بابو، تو بیماری کو ہنسی خوشی جھیلنے سے بھی آدمی ٹھیک ہو جاتا ہے —— وہ بے چارہ رونے لگا —— روؤ نہیں، بابو —— بابو —— بابو ! —— مجھے کیا پتہ تھا کہ بابو کتا بھی پاس ہی کھڑا ہے۔ اس نے مجھے اس کا نام اس لونڈے کے حوالے کرتے ہوئے پایا تو غصے میں چھلانگ لگا کر دوش کی پنڈلی کو اپنے دانتوں میں لے لیا —— بابو جہاں بھی ہو میرے یہاں پہنچتے ہی بو پا کر دم ہلاتے ہوئے چلا آتا ہے۔

مجھے اپنی طرف متوجہ نہ پا کر وہ اپنے بند منہ سے غرایا ہے۔

ہاں، ہاں، دیکھ لیا ہے بابو۔ کہو، کیسے ہو؟

میں نے اس کی طرف سر اٹھایا ہے اور اُس کے منہ میں ایک سالم ڈبل روٹی دیکھ کر میرا پیٹ خالی ڈھول کی طرح تھپّی بجنے لگا ہے —— آؤ۔

میں گلی کے بیچ میں ہی بیٹھ گیا ہوں اور اس نے اپنا منہ کھول کر ڈبل روٹی میرے آگے مٹی میں گرا دی ہے۔

ارے بے وقوف، مٹی میں کیوں گرادی ہے ؟ کھانے والی چیزوں کو تو آنکھوں میں اٹھا کر رکھتے ہیں۔

[illegible] اس کے آگے ڈال دی ہے اور آدھی پر اپنا منہ مارتے ہوئے

مجھے یاد آیا ہے کہ آج میں نے چھوٹو کے ہاتھ فقیرے کو روٹی بھیجی تھی۔ بھوکا آدمی ہے۔ اس نے آپ ہی کھالی ہوگی ـــــ میں ہنسنے لگا ہوں، خالی پیٹ میں ڈبل روٹی اترنے سے یا اپنے اس خیال پر، کہ جسے ہم کتا کہتے ہیں اس کی تو بھوک سے جان نکل رہی ہوتی ہے مگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ آدمیوں کی طرح پچھلی دو ٹانگوں پر کھڑا ہو جائے اور اگلی کو ہاتھوں کی طرح باندھ کر ہم سے اپنی اجرت کی بھیک مانگتا رہے ـــ میں نے گویا فقیرے کو پیار کرنے کے لیے بابو کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا ہے اور اس بے زبان نے بھونک کر مجھ سے پوچھا ہے، اور لاؤں!

مجھے معلوم ہے کہ باہر سڑک پر جب وہ چڑچڑا اور بڈھا حلوائی گدی پر بیٹھے اونگھنے لگتا ہے تو بابو موقع پاتے ہی اس کے تھالوں سے کچھ نہ کچھ اُچک لیتا ہے۔ بڈھا بیچارہ ہر چیز گنتی سے رکھتا ہوگا۔ مگر اس کے کم پڑ جانے پر اپنے بوڑھے حافظے اور جوان بیٹے کو کوستا ہوگا ـــــ حرام کی اولاد آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے۔ سارا کام سنبھال لے تو میں کیوں ہڈیوں کو کوٹ کوٹ کر لڈو بناتا رہوں۔ ؟ تین چار دن پہلے میری جیب پیسوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے بابو سے کہا، آؤ، آج بڈھے کو پیسے دے کر کھاتے ہیں۔ بابو میرے آگے آگے گویا سوٹ بوٹ پہن کے ہو لیا اور بڈھے کی دکان پر اس نے بڑی شان سے بھونک لگائی، دو ڈبل روٹیاں دو۔ جلدی!

بابو نے پھر سے پوچھا ہے بس، یا اور لاؤں!

نہیں، اتنی ہی بہت ہے۔ آؤ، اب اپنا کام کریں۔

سب سے پہلے میں کوڑے کے ڈرم کو اُلٹ دیتا ہوں اور بابو میری سہولت کے لیے پنجے مار کر کوڑے کو خوب پھیلا دیتا ہے اور پھر میں اپنے مطلب کی چیزیں چن کر کوڑا اکٹھا کر کے ویسے ہی ڈرم میں ڈال دیتا ہوں ہر کوٹھی کا ڈرم الٹتے ہی ان لوگوں کی ساری گندگی میری آنکھوں میں آجاتی ہے۔ خدا بچائے میرا دھندہ ہی یہی ہے۔ مجھے معلوم ہے اوروں کی گندگی کھیانا اچھا کام نہیں، گند ڈھنپا ڈھنپا نہ ہے تو روگ ہی پھیلتے ہیں مگر کیا کروں؟ ان کے کوڑے کے ڈھکنے نہ کھولتا رہوں تو بھوکوں مروں

آؤ! ـــــ میں نے تین نمبر والوں کا ڈرم اُلٹ کر بابو سے کہا ہے۔ مجھے پہلے سے ہی پتہ ہے کہ اس ڈرم سے ردی کاغذ، شراب کے خالی اَدھے اور پوے اور سگریٹ کے بے حساب ٹکڑے نکلیں گے منو کباڑیا کہتا ہے کہ اخبار کا کاغذ لایا کرو۔ کہاں سے لے جاؤں اخبار کا کاغذ؟ گھر والے کو خبروں کی تو وہ بھی تو ہو دے تو اتنا بھی علم نہیں کہ اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ پروفیسر صاحب جب رات دن اپنی الم غلم سوچوں سے کورے کاغذ کالے کر کر کے ردی کی ٹوکری بھر رہے ہوتے ہیں تو ساتھ کے کمرے میں ہی اُن کی بیوی کی جوان نوکر کو گرما رہی ہوتی ہے ـــــ سب سے پہلے میں خالی بوتلوں کو اٹھا کر جھولے میں ڈالنے لگا ہوں ـــــ کیا مجال، کسی بوتل میں شراب کی ایک بوند بھی باقی ہو۔ سالا نوکر ہر بوتل میں رہی سہی کو پانی میں گھول کر غٹ غٹ چڑھا جاتا ہے، نہیں تو اتنی بوتلوں میں سے بوند بوند بھی جمع کر لیا کروں تو ہفتے میں ایک بار تو میرا جلسہ ہو ہی جایا کرے ـــــ ہاں، اس دن مجھے اس ڈرم سے ایک پورا آدھ کھلا اَدھا مل گیا تھا۔

انجانے میں پھینک گیا ہوگا ورنہ اس ماں کے یار کے ہتھے چڑھ جاتی تو اسے کیا اپنے باپ کے لیے یہاں ڈال جاتا! میں اسی دم کام دھندا چھوڑ کے خوشی سے ہانپتے ہوئے سیدھا اپنی جھونپڑی میں چلا آیا اور خالی پیٹ بوتل خالی کرکے سارا دن اور ساری رات فرش پر اوندھا پڑا رہا۔ فقیرا غصے سے غرا غرا کر میرا بدن لنگڑاتا رہا مگر نشے میں مجھے یہی لگتا رہا کہ میرے نصیب کھل گئے ہیں اور دودھیا چام سے لدی ہوئی گھر والی سچ مچ کہیں سے میرے ساتھ لیٹنے کو آگئی ہے اور میرے بدن کو چوم چاٹ کر میری جنم جنم کی تھکان چوسے جا رہی ہے ـــــ دوسرے دن میری آنکھ کھلی تو فقیرے نے مجھے دل کھول کر سنائیں میں پہلے تو اسے شرمندگی سے سنتا رہا پھر سر اوپر اٹھائے بغیر اس سے کہا، اب چھوڑ و بھی باپ مو رے، جو ہو گیا سو ہو گیا۔ پروفیسر کی ردی سوچوں کا پلندہ باندھتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو بتایا ہے کہ اتنا بوجھل ہو گیا ہے پر منّو نو سے دس پیسے قیمت لگانے پر بھی راضی نہ ہوگا ـــــ اب میں نے سگریٹ کے ٹکڑوں پر آنکھیں لگالیں۔ اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں کہ جیب تک انگلیاں نہ جلتی ہوں گی، اپنے اردگرد دھوئیں کے غبار گھیرے کرتا جاتا ہوگا ـــــ ارے بھئی، کچھ سوچنا ہی ہے تو باہر آکے سیدھا سیدھا دیکھ کے سوچو، جس کیلئے سوچیں بنی ہوئی ہیں، یہ کیا، کہ اپنی سوچوں کے بارے میں ہی سوچتے چلے جاؤ ـــــ میں نے دو چار سگریٹ کے ذرا بڑے ٹکڑے چن کر جیب میں رکھ لیے ہیں۔ ایک ایک، دو دو کش تو نکل ہی آئیں گے ـــــ ارے بس! ـــــ میں نے بابو سے کہا ہے اور ملبے کو واپس ڈرم میں ڈالنے کے لیے اکٹھا کرنے لگا ہوں۔

ابھی تک میں یہی سمجھ رہا تھا کہ میں آپ ہی اپنے دماغ میں بولے جا رہا ہوں۔ دراصل ہو یہ رہا ہے کہ کوئی مینڈک اگلے گھر کی ڈھکی ہوئی نالی کی سڑاند میں پھدکتے ہوئے بے تحاشہ ٹرٹر کیے جا رہا ہے اتنے میں میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک سانپ کہیں سے سائیں سائیں وارد ہو کر اس کے پیچھے نالی میں جا گھسا ہے۔

کیوں، بھونک رہے ہو بابو؟ مینڈک کو جان پیاری ہے تو جو دیکھتا ہے اسے چپ چاپ دیکھتا رہے، دیکھ کر ٹرٹر کیوں کرنے لگتا ہے؟ ـــــ ایک بات یاد رکھو بابو ـــــ یہ ساری دیواریں اس لیے حفاظت سے کھڑی ہیں کہ کچھ بھی ہو جائے سدا چپ رہتی ہیں۔ بولنے لگیں تو اسی دم ڈھے جائیں ـــــ اچھا، یہ بتاؤ اس کی عورت رات کو اتنی دیر سے کہاں سے آتی ہے؟ جن کے ساتھ آتی ہے ان کی گاڑی ذرا فاصلے پر رکوا لیتی ہے اور بلی کی طرح پنجوں پر چلتی ہوئی پچھواڑے سے اپنے گھر میں داخل ہو جاتی ہے۔ نہیں، مورکھ، اس کے شوہر کو سب کچھ معلوم ہے۔ وہی تو اس کی غیر حاضری میں بچوں کو سنبھالتا سلاتا ہے ـــــ جب وہ لوٹتی ہے تو دروازہ کھولتے ہی وہ اس کا وہ ہاتھ اندر کھینچ لیتا ہے جس پر اس کا بٹوہ لٹک رہا ہوتا ہے۔ اتنی دیر تک راہ تکنے کے بعد اب کہیں بیچارے کی باری آتی ہے کہ بیوی کے ساتھ سوئے ـــــ نہیں، چپ! ہمیں کیا لینا دینا ہے؟ کلرک آدمی ہے تو کیا؟ کتنی آن بان سے رہتا ہے! ہاں دفتر کی تنخواہ پر تو گزر بسر بھی نہ ہو۔ جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے۔ اتنی شاندار کوٹھی میں رہتا ہے اور اپنا سارا کوڑا روز کے روز صاف کرکے باہر پھینک دیتا ہے ـــــ ہاں تم ٹھیک ہی کہتے ہو بھائی اس سے تو اچھا ہے کہ رال ٹپکا ٹپکا کر اوروں کا کوڑا پھوڑتا رہے۔

اس کوٹھی کا ڈرم اکثر خالی ہی ہوتا ہے کیوں کہ یہ لوگ اپنے پچھواڑے کا بھی آگا صاف دکھانے کے لیے ہی گندگی آس پاس والوں کے ڈرموں میں ڈال دیتے ہیں۔ میں اس ڈرم کو کھوجے بغیر آگے بڑھ جاتا ہوں مگر پھر خیال آتا ہے کہ ایک نظر دیکھ ہی لوں۔ ڈرم میں بالوں کے ایک سنہری کلپ نے مجھے دیکھ کر آنکھ ماری ہے، شاید سونے کا ہے۔ میں نے تیزی سے اسے ہاتھ میں لے لیا ہے ـــــ نہیں، تانبے کا ہوگا ـــــ مجھے سونے کی پہچان ہے، نہ تانبے کی۔ منو کباڑیہ تو کھرا سونا بھی لے تو تانبے کے دام پر ہی لے۔ میں نے کلپ کو اپنی جیب میں ڈال لیا ہے اور سوچنے لگا ہوں کہ رلدو کی جورو کے بالوں میں اس کی سج دھج کیسے سجے گی۔ اگر سونے کا ہے تو لوگ نہیں، دس بار کا سودا پکا کر کے دوں گا ـــــ میرے قریب ہی ایک جھونپڑی میں رلدو بھی اپنی جورو سے پیشہ کرواتا ہے۔ مگر اس کی یہ خوبی ہے کہ وہ کھلے کھلے سب کچھ کرتا ہے ـــــ ارے بھائی ـــــ ایک دن وہ مجھے بتا رہا تھا، جب مجھے شک ہونے لگا کہ میری عورت کے کچھن ٹھیک نہیں تو میں اسے ویشیا سمجھ کر ہی اس سے پیش آنے لگا۔ کسی دوسری کے پاس جاؤں تو پورا سو روپے کے بھی آنا خیال نہ رکھے ـــــ وہ تو کئی سو دیتی بھی ہے اور میرے پسینے پر خون بھی بہاتی ہے۔ سمجھے! ـــــ میں نے اپنے آپ سے کہا ہے کہ میں کیا سمجھوں۔ کوئی رل جائے تو سمجھ میں بھی آجائے۔

یہ دیکھ کر کہ میں اسی نالی کے منہ پر کھڑا ہوں جس میں وہ سانپ داخل ہوا تھا۔ میں ڈر کے مارے اتنا تیز تیز آگے ہولیا ہوں کہ قریب ہی ایک مرغی میری ٹانگوں میں سے پھڑپھڑا کر میرے آگے نکل گئی ہے اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے لگتا ہے کہ میں رلدو کی جورو کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔

اگلے ڈرم کا کوڑا ابھر بھر کے نیچے زمین پر بکھرا ہوا ہے۔ ڈرم کو الٹنے سے پہلے میں اس کے پہلو میں بیٹھ گیا ہوں اور ابھی میری آنکھیں زمین پر اپنے مطلب کی چیزیں ڈھونڈ ہی رہی ہیں کہ اس کوٹھی والوں کی نوکرانی یکلخت دروازے سے نکلی ہے اور میرے سر پر گھر کا فضلہ اس طرح الٹ دیا ہے۔ جیسے کوڑے کے ڈھیر پر ہی کوڑا پھینک رہی ہو۔ میں اس وقت تک سانس روکے ڈھیر کا ڈھیر پڑا رہا ہوں جب تک اس نے واپس اپنے دروازے میں داخل ہو کر اندر سے چٹخنی نہیں چڑھالی ہے اور پھر بدن جھٹک کر کھڑا ہو گیا ہوں اور ڈرم کو ٹیڑھا کرتے ہوئے بابو کو اشارہ کیا ہے کہ اپنا کام شروع کر دو۔

اس ڈرم کے گھر والے دو بھائی ہیں جو کپڑے کا بیوپار کرتے ہیں۔ بڑا بھائی دولت کے نشے میں کھویا ہوا ہے اور چھوٹا ہے ہی پاگل۔ بڑا نیچے رہتا ہے اور چھوٹا پہلی چھت پر، اور سب سے اوپری چھت پر ایک کمرہ ہے جس میں ان دونوں کی بوڑھی اور اپاہج ماں رہتی ہے۔ کئی بار بوڑھیا کے رونے کی آواز سن کر میں اپنا کام روک کر سر اٹھائے اوپر دیکھنے لگتا ہوں اور میری نظر آنکھوں سے نکل کر بوڑھیا کے پاس جا پہنچتی ہے ـــــ یہ دیکھو، تمہارے لیے گڑ کے چنے لایا ہوں ماں۔ دانت نہیں ہیں تو گڑ ہی چوس لو ـــــ کھیر! کھیر کہاں سے لاؤں ماں! ان بھائیوں کے نوکر نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ بوڑھیا ہر وقت کھیر مانگ مانگ کر روتی رہتی ہے اور چپ ہوتی ہے تو آسمان

کی طرف سر اُٹھاکے اس طرح منہ کھول کر بلا رہی ہوتی ہے جیسے اوپر سے منہ میں کھیر ٹپک رہی ہو ــــ اپنی ماں کو تو یہ بھائی ترسا ترسا کر مار رہے ہیں مگر ان کے ڈرم میں اتنی جھوٹن ہوتی ہے کہ دس لوگوں کا آرام سے پیٹ بھر جائے۔ منّو کباڑیا جس دن مٹھی گرم نہیں کرتا اس دن میں یہیں سے اپنے پیٹ کا ایندھن چن لیتا ہوں۔ منہ بنا بنا کر کھانا شروع کرتا ہوں مگر کھاتے ہوئے جو مزہ آنے لگتا ہے تو اس وقت تک بالو کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا جب تک خوب سیر نہ ہو جاؤں۔ دونوں کی بیویاں آپ تو کھٹ مٹھی ہیں ہی کھانا وہ اپنے سے بھی کھٹ مٹھا بنا لیتی ہیں اسی لیے دونوں بھائیوں کے پیٹ اتنے پھولے ہوئے ہیں۔ اپنے نوکر بتیا کو انھوں نے نکال دیا ہے۔ وہ مجھے بڑوں کے دھوئیں میں ان کی دھواں دھواں باتیں بھی سناتا تھا۔ اچھا ہی ہوا جو وہ چلا گیا ورنہ ہیں اپنا کام دھندہ چھوڑ کر اس کے ساتھ بیٹھ جاتا تھا۔ بڑا بھائی اپنے پچھلے بھائی کو اس طرح ڈانٹتا رہتا ہے جیسے اپنے بیٹوں کو، مگر اس کی بیوی کو جہاں تہاں اکیلا پا لیتا ہے تو ہاتھ ڈالنے سے باز نہیں آتا۔ چھوٹی کے پانچوں کے پانچوں بچے بڑے بھائی کے ہیں ــــ بتیا نے مجھے بتایا تھا ــــ لو، اور بڑی پیو! ــــ اور سناؤں ! بڑی بھی اپنے آدمی سے کم نہیں۔ اس نے اپنے باؤلے دیور کو ایسے رام کر رکھا ہے کہ اس کی سمجھ میں اور کچھ آئے، نہ آئے، وہ اپنی پیاری بھابی کی بات کو فوراً بجا جاتا ہے۔ بڑی کے دونوں چھوٹے بچوں کا منہ ماتھا ہو بہو اپنے باؤلے چچا کا سا ہے۔ اس بالی عمر میں وہ اتنے گمبھیر اور سخت ہیں کہ انہیں دور سے دیکھ کر ہی پچھلے کو وہ دو باپ نظر آنے لگتے ہیں اور خوف سے اس کا پیشاب نکل جاتا ہے۔

بتیا کو بھائیوں نے اس لیے نکال پھینکا تھا کہ رن بھومی کے تیور دیکھ کر ایک دن اس بیچارے کی کھوپڑی اُلٹی ہو گئی اور وہ بڑی کو ماں کہنے کے باوجود اُسے لوٹ کا مال سمجھ بیٹھا اور اپنے باؤلے مالک کی طرح منہ میں انگوٹھا ڈال کر اس کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا، پر چھوٹی ہو یا بڑی، مال تو بھائیوں کا ہی تھا، بتیا کو مار مار کر باہر نکال دیا گیا شریفوں کے گھروں میں کمینوں کا کیا کام ؟ جاؤ ــــ جاؤ، جو یہاں کرنا چاہتے تھے اپنی ماں بہن سے کرو۔

میں اُن کی گندگی کو پھوڑ پھوڑ کر دیکھ رہا ہوں۔ منّو کباڑیے نے مجھے بتایا تھا کہ بڑے دکانداروں کے ڈرم دھیان سے دیکھا کرو۔ یہ لوگ کالا دھندا کرتے ہیں اور جب پولس کے چھاپے کا ڈر ہو تو جان بچانے کے لیے نوٹوں کی گڈیاں بھی کوڑے میں پھینک دیتے ہیں۔ نامعلوم مجھے کیوں یقین سا ہے کہ کبھی نہ کبھی ضرور مجھے یہاں سے نوٹ بھی ہاتھ آئیں گے مگر اتنے سارے نوٹوں سے میں کروں گا کیا ؟ ــــ منّو کباڑیے کے پاس لے جاؤں گا؟ ــــ وہ تو سارے نوٹوں کی کل قیمت بھی روپے دو روپے سے زیادہ نہیں لگائے گا ــــ اب تو خوش ہو نا؟ قیمت سے پورے پچیس پیسے زیادہ دے رہا ہوں ــــ

آج مجھے بھائیوں کے یہاں سے کچھ بھی نہیں مل رہا۔ چھوٹی اور بڑی کی ماہواری کی سوکھی کترنیں ان کی جھوٹن میں بھیگ رہی ہیں، یا پھر نرودھ کے چند ٹکڑے ہیں جنھیں میں نے صاف کر کے تھیلے میں پھینک لیا ہے۔ ہر گھر کے ڈرم سے چند ایک ٹھیک ٹھاک ٹکڑے مجھے ضرور مل جاتے ہیں۔ کبھی بار تو کوڑی سے بھی اوپر ہو جاتے ہیں۔

ں انہیں بھی منو کو ہی تھما آتا ہوں ـــــ انہیں صابن سے دھو کے لایا کرو فجو ـــ میں تو ایسے ہی لے جاتا ہوں۔
تے پیسے بھی نہیں دیتا کہ دیسی صابن کا ایک ٹکڑا ہی مل جائے۔ اپنے سر سے دھوؤں؟ چھوٹی اور بڑی کے بالوں
کے گچھوں کو بھی صاف کر کے میں نے جھولے میں ڈال لیا ہے۔ منو بولتا ہے۔ سنہری بال لایا کر ـــــ سنہری بال لانے
کے لیے ولایت جاؤں؟ ـ جو ملتا ہے وہی لے کے شکر کرتے جاؤ منو بھائی۔ عورتوں کی بدھی بھرشٹ ہوتی
جا رہی ہے۔ یہی حالت رہی تو سب کی کھوپڑیاں گنجی ہوا کریں گی۔ پھر سنہری تو کیا، سفید بال بھی دیکھنے میں نہ آئیں
گے ـــ اچانک مجھے اوپر سے بھائیوں کی بوڑھیا کے رونے کی آواز سنائی دینے لگی ہے۔ دونوں بیٹے جھگڑ رہے ہوں گے
ایک دوسرے کی بیوی کو لیے پڑے ہوں گے، بوڑھیا کی خبر کون لے؟

میں سوچنے لگا ہوں کہ بوڑھیا اگر اپنے گھر والوں کے لیے کوڑا ہو کر رہ گئی ہے تو وہ اُسے دھپ سے باہر
کوڑے کے ڈرم میں کیوں نہیں ڈال دیتے؟ میں خیال ہی خیال میں بوڑھیا کو پونچھ پانچھ کر اپنی جھونپڑی میں لے
آیا ہوں۔ لو بھائی فقیرے، دیکھو ہم دونوں کی ماں آئی ہے میری جھونپڑی میں رکھا ہی کیا تھا جس پر پہرہ دیتے
رہتے تھے؟ گھر تو اب بھرا ہے۔ جی بھر کے اب ماں کی دیکھ ریکھ کیا کرو ـــ لو ماں، تمہارے لیے یہ گڑ کے
چنے لایا ہوں ـــ گڑ کے چنے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اور میں فقیرے پر اکثر اس لیے چڑنے لگتا ہوں کہ مجھے گڑ کے
چنا کھاتے دیکھ لیتا ہے تو بے اختیار بھونکنے لگتا ہے۔ ارے بھئی تمہیں اچھے نہیں لگتے مگر مجھے تو کھانے دو ـــ
کھاؤ ماں۔ دانت نہیں تو گڑ ہی چوس لو ـــ لو، اور لو! ـــ

ماں گڑ کے چنوں کا گڑ چوس رہی ہے اور اس کا ذائقہ میرے خالی منہ میں گھل رہا ہے اور فقیرے میرا مذاق
اڑانے کے لیے بھونک رہا ہے۔ ارے چل ہٹ! ـــ کتے کی ذات، تمہیں کیا پتہ، آدمیوں کا کھانا کیا ہوتا ہے؟
تم کھاؤ، ماں ـــ اور دوں؟ نہیں، میری ماں نہیں ہے، کبھی نہ تھی ـــ میرا باپ؟ ماں ہی نہ تھی تو کس نے
اُسے گلے لگا کر مجھے پیدا کیا ہوگا ـــ کسی ملبے میں سے آپ ہی آپ کلبلاتے ہوئے پھوٹ پڑا ہوں گا ـــ لو ماں'
اور لو! ـــ

میں یونہی کوڑا روے جا رہا ہوں۔ وہاں کچھ ہو تو ملے بڑی ٹھنڈی سانس بھر کر میں گھٹنوں کے سہارے اٹھ
کھڑا ہوا ہوں اور ابھی چند ہی قدم چلا ہوں کہ کسی بچے کے رونے کی نحیف سی آواز سن کر میرے کان کھڑے
ہو گئے ہیں۔ میں نے بڑے دھیان سے اپنے آس پاس دیکھا ہے۔ کوئی بھی تو نہیں! ـــ آواز پھر آئی ہے ـــ
اور ہم دونوں جانور، بابو اور میں ـــ ایک دم ایک سمت ہو لیے ہیں اور ایک کھلے ڈرم کے پاس آ کھڑے ہوئے
ہیں جس میں کوڑے کی بیچ پر ایک نوزائیدہ بچہ اپنی پیٹھ پر لیٹے ننھے منے ہاتھ پیر مار رہا ہے اور اُسے دیکھ دیکھ کر مجھے
لگا ہے کہ میری چھاتیاں دودھ سے بھر کر پھول گئی ہیں اور میں نے اُسے اپنی آنکھوں کی ساری نرمی سے ہاتھوں میں لے
لیا ہے اور سوچنے لگا ہوں، کیا سے آگیا ہے! سنگدل اپنی نسلوں کو پیدا ہوتے ہی کوڑے میں ڈال دیتے ہیں! ـــ

بے گور

کلکتہ کے فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک کمرے کی گھنٹی کی آواز سن کر امریکی ڈاکٹر دروازہ کھولنے لگا۔

"کون؟"

"میں رام دین ہوں صاحب!"

"تم آگئے؟ آؤ میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"اگر آپ تیار ہیں تو چلیے۔"

"ہاں چلو۔ کیا پورے پچاس کا انتظام ہوگیا؟"

"ہاں، صاحب۔ سو یا ہزار بھی ہوتے تو یہاں کیا کمی ہے؟"

"تو چلو۔"

وہ دونوں کمرے سے نکل کر باہر ہوٹل کے پورچ میں پہنچے تو امریکی ڈاکٹر کا ڈرائیور اُسے دیکھ کر کار وہیں لے آیا۔ امریکی ڈاکٹر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور رام دین آگے ڈرائیور کے ساتھ۔

"کہاں چلنا ہے؟"

چاؤرنگی۔

"کیا یہ نام کسی بہت بڑے مردہ خانے کا ہے؟"

"نہیں — ہاں، یہی سمجھ لیجیے صاحب۔"

"چلو، ڈرائیور۔"

ڈرائیور نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا تو وہ پہلے تو کسی ذی رُوح کے مانند کچھ کھی ہنس پڑی اور پھر گویا کھڑے کھڑے ہوٹل کے باہر آگے سڑک پر اُڑنے لگی۔

"تم نے واقعی کمال کر دیا رام دین۔ ایک دم پورے پچاس کا انتظام کر دیا۔"

"ہمارے دیس میں بڑی سے بڑی ضرورت کا بھی ایک دم انتظام ہو جاتا ہے۔ بس آپ کی جیب میں پیسے ہوں۔"

"فکر مت کرو، مال ملتے ہی دام چکا دیے جائیں گے۔"

نہیں صاحب، پیسوں کی مجھے فکر نہیں۔ آپ کے ملک سے میرا پُرانا لین دین ہے۔ مجھے معلوم ہے امریکی بڑے کھرے اور زندہ لوگ ہوتے ہیں۔"

"یہی تو ہم ڈاکٹروں کی مصیبت ہے ہمارے دیس میں کسی کے مرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔"

"لیکن مرنے والے تو مرتے ہی ہوں گے؟"

"نہیں مرنے کا ارادہ کر کے بھول جاتے ہیں۔"

"ہہ ہہ ہا —— ہہ —— ہمارے ڈاکٹر تو ہر وزٹ کی فیس ساتھ ساتھ چارج کر لیتے ہیں کہ اگلے وزٹ سے پہلے ہی مریض چلتا نہ بنے۔"

"ہاں، جہاں موتیں اتنی عام ہوں وہاں ڈاکٹر کیا کریں؟ چھوٹے چھوٹے بل وصول کرنے کے لیے کیا وہ مُردوں کے پیچھے ہو لیا کریں!"

امریکی ڈاکٹر کی نگاہ اچانک باہر کے لوگوں کے سیلاب پر اُٹھ گئی اور وہ جھر جھری سی لے کر رہ گیا۔ کسی کے چہرے پر شخصی زندگی کے آثار نہ تھے۔ سب ہی اپنے آپ ادھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بے خبر نہیں، لیکن نہ جانے کہاں۔ اُن کی آنکھیں انہیں کچھ بتائے بغیر دیکھ رہی تھیں۔ پاؤں از خود اُٹھ رہے تھے۔ اتنا شور و شغب تھا مگر انہیں کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

ڈاکٹر نوٹ بک اور قلم نکال کر لکھنے لگا۔

۱۵ جون، ۱۹۵۷ء۔ کلکتہ کی ایک سڑک۔ سڑک پر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ہیں، مگر تعجب ہے کہ کسی میں بھی زندگی کے کوئی آثار نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قبروں میں ان کا دم گھٹنے لگا اور سب کے سب باہر نکل آئے۔ یا باہر آ کے تھک ہار گئے اور اب قبروں کی طرف لوٹ رہے ہیں...... وہ لکھتے ہوئے رُک گیا اور کار کے باہر گھورنے لگا۔ کیا یہ لوگ واقعی زندہ ہیں؟ —— اس سانحہ کی طبی نوعیت تک پہنچنے کے لیے وہ بڑی جوش آفریں متانت سے سوچ رہا تھا۔ ہاں، کیوں نہیں! اگلے مہینے میں اپنے یہاں ڈاکٹروں کی کانفرنس میں بڑی سنجیدگی سے یہ سوال اٹھاؤں گا —— عین ممکن ہے کہ..... نہیں، نہیں کیوں؟ ہو سکتا ہے کہ انسانی مشین بدستور چلتی رہے مگر انسان مر چکا ہو۔

ہاں، ــــ اسے ثابت کیا جا سکے تو ــــ نہیں : ایسا کیسے ہو سکتا ہے ؟ ــــ وہ پھر باہر دیکھنے لگا ــــ
نہیں، جب ہو ہی گیا ہے تو کیسے نہیں ہو سکتا ؟ ــــ وہ مسکرانے لگا۔

سامنے چوک پر میکانیکی سرخ بتی آجانے پر ڈرائیور نے پٹری کی جانب اپنی قطار میں گاڑی روک لی اور ڈاکٹر چہروں کی بھیڑ میں کسی ایک پر نظر جمانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر طغیانی میں آنکھیں کہاں ٹک پاتی ہیں ؟ اسی اثنا میں اس کی گاڑی کے قریب سے چند لوگ گزرنے لگے اس نے اپنا سر کھڑکی کی طرف بڑھا کر ان کی طرف مسکرا کر دیکھا مگر وہ اس سے ایک دوسرے سے، اپنے آپ سے بھی قطعی بے خبر چلتے گئے ــــ گرین لائٹ آتے ہی کار حرکت میں آگئی ــــ ان لوگوں میں سے کوئی شخص مجھ سے اپنی موت کا سرٹیفکیٹ طلب کرے تو ؟ ہاں، کیوں نہیں اگر وہ زندہ نہیں تو اسے اپنی موت کا سرٹیفکیٹ طلب کرنے کا حق حاصل ہے یا پھر کسی موت کا قانونی سرٹیفکیٹ دینے سے پہلے کسی طرح کا طبی معائنہ صحیح ہوگا ؟

ڈاکٹر نے اپنے خطیبانہ سوال سے بے چین ہو کر سگریٹ سلگا لیا، لیکن شاید سگریٹ نوشی کے خطرناک نتائج پر کسی مقالے کا اچانک خیال آجانے پر اسے فوراً بجھا دیا اور سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"صاحب..... ب !"

"ہاں۔ ں !" ڈاکٹر نے اپنے خیالات سے چونک کر جواب دیا۔

"وہ ــــ ادھر ــــ وہ پٹری ہے نا۔ کوئی پون گھنٹہ پہلے کی بات ہے کہ میں یہاں سے گزر رہا تھا ــــ وہ ــــ وہاں اس ستون کے پاس پڑی ہوئی ایک لاش یک بارگی اٹھ کھڑی ہوئی اور چلانے لگی "سنو ! ارے بھئی !" مگر کسی نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ وہ اور زور سے چلانے لگی : ایک لاش تم سے مخاطب ہے لوگو ! سنو ــــ لوگ اس کی طرف دیکھے بغیر اپنی اپنی راہ چلتے رہے۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا رام دین ! جسے تم لاش کہہ رہے ہو ساری بھیڑ بھاڑ میں صرف وہی زندہ ہو اور باقی سارے کے سارے مردہ !"

"مگر صاحب، ان باقی سب لیں تو میں بھی تھا۔ اگر آپ میرا فری میڈیکل ٹیسٹ کرنے پر رضامند ہیں تو بے شک اطمینان کر لیجیے۔ میں تو زندہ ہوں !"

"تو پھر تم ہی اس لاش کی مدد کرنے کے لیے رک گئے ہوتے۔"

"کیسے رک جاتا ؟ مجھے عین وقت پر آپ سے ہوٹل میں ملنا جو تھا۔"

"پورے پچاس کا انتظام کر کے آئے ہو نا ؟"

"ہاں صاحب، کہہ دیا نا پورے پچاس کا۔ آپ چاہیں تو پورے سو بھی خرید سکتے ہیں۔"

"ویری گڈ ! ــــ اچھا تو ذرا بھلا وہ لاش کہنا کیا چاہ رہی تھی ؟"

"صرف یہ کہ مجھے دم توڑے چھ گھنٹے سے بھی اوپر ہو لیے ہیں، کوئی خدا کا بندہ مجھ پر رحم کھائے اور کسی

قبرستان کی راہ پر ڈال آئے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا! کسی نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ بے چاری مایوس ہوکر آپ ہی اپنے لیے کوئی قبرستان ڈھونڈنے کہیں نکل گئی ہوگی۔"

"مگر کیا وہ لاش سچ مچ کی لاش تھی!"

رام دین ہنسنے لگا۔"آپ اتنے پہنچے ہوئے ڈاکٹر ہیں صاحب۔ آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ لاش ہوگی تو سچ مچ کی ہی ہوگی۔"

"ہاں، ہاں، اس میں کیا شک ہے!"

امریکی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا سوچے اس لیے سوچے بغیر وہ رام دین سے پوچھنے لگا "کیا تمہارے یہاں موت کا سرٹیفکیٹ لینا ضروری نہیں!"

رام دین پھر ہنس پڑا۔"آپ امریکی لوگ اتنے سمجھ دار ہوتے ہیں صاحب پھر بھی بھولے کے بھولے۔ اس لاش کو کوئی قبرستان کے راستے پر بھی نہیں ڈال رہا تھا۔ غریب موت کے سرٹیفکیٹ کے لیے دفتروں کے چکر کہاں کاٹتی پھرتی ۔۔۔ یا پھر رشوت دے کر زندگی میں ہی سرٹیفکیٹ حاصل کر لیتی۔ مگر رشوت کے پیسے ہوتے تو ان سے دوا دارو کر لیتی۔ اس کا مرنا ہی کیوں ہوتا!"

رام دین کے مذاق کا لہجہ ڈاکٹر کو بھونڈا بھی لگ رہا تھا اور دلچسپ بھی۔

"آپ شاید یہ سوچ رہے ہیں صاحب، کہ سرٹیفکیٹ کے بغیر اس بھلے آدمی کو پتہ کیسے چل گیا کہ اس کی موت واقع ہو چکی ہے۔"

"ہاں، ہمیں تو کسی کے مرنے کا یقین اسی وقت آتا ہے جب اس کی موت کی ڈاکٹری تصدیق ہو جائے۔"

"آپ کی بات اور ہے صاحب۔ ہمارے سارے سرٹیفکیٹ جعلی ہوتے ہیں، اس لیے ہمیں اپنی موت پر اسی وقت یقین آتا ہے جب ہم آپ ہی محسوس کرنے لگیں کہ ہم مر چکے ہیں ۔۔۔ ڈرائیور اب یہاں سے بائیں طرف مڑ جاؤ۔ ہمیں اسی گلی میں آنا تھا۔"

"تم لوگ اپنے ہسپتال اتنی تنگ اور گندی گلیوں میں کیوں بنواتے ہو؟"

"یہ ہسپتال نہیں ہے۔"

"مگر مردہ خانہ تو ہسپتال کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔"

"آپ آئیے تو صاحب، ہمارے غریبوں کو دوا خانے اور مردہ خانے کہاں نصیب ہوتے ہیں! ۔۔ ٹھہر جاؤ، ڈرائیور! بس یہیں!"

گاڑی رک گئی۔

امریکی ڈاکٹر نے دیکھا کہ کئی پھٹے حال بوڑھے، جوان اور بچے گلی میں ایک طرف قطار باندھے کھڑے ہیں۔

"یہاں کہاں لے آئے ہو؟"

"جہاں ہمیں آنا تھا" رام دین گاڑی سے نکلتے نکلتے بات پوری کرنے کے لیے رک گیا۔

"آپ کے پاس آنے سے پہلے میں ہی انھیں یہاں کھڑا کر گیا تھا"

"مگر میں نے تو مُردوں کا آرڈر دیا تھا"

"غور سے دیکھئے صاحب، کیا یہ لوگ آپ کو زندہ معلوم ہوتے ہیں؟"

"مجھے یہ مذاق پسند نہیں، رام دین"

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، صاحب، مُردوں کو تو اپنے مر چکنے کا احساس بھی نہیں ہوتا، مگر انھیں غور سے دیکھئے، ہر ایک کو پورا احساس ہے کہ وہ مر چکا ہے"

امریکی ڈاکٹر گھبرا کر ان مفلوک الحال لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"عجیب آدمی ہو! میں نے تو کہا تھا ہمیں اپنے ملک میں طبی تجربوں کے لیے پچاس مُردوں کی ضرورت ہے"

رام دین ہنسنے لگا "نہیں صاحب، مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ اتنی دور سے قبریں کھدوانے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے تو سوچا تھا ساری دنیا کے ملک ہمارے دیس سے آدمی لے جاتے ہیں، آپ کو بھی ان سے کوئی ایسا کام لینا ہوگا جو صرف مرے کچلے لوگ ہی کر سکتے ہیں" رام دین اپنی ململ کی ٹوپی اتار کر سر کھجانے لگا۔

"ایک بات کہوں صاحب؟ — ان سب کو آج کل میں مر ہی جانا ہے۔ بہت سے تو راستے میں جہاز پر ہی دم توڑ دیں گے — ان کی شکلیں دیکھیے اور بتائیے، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ پہلے سے ان ہی کو لے جائیے"

"بکواس بند کرو اور صاف صاف بتاؤ کیا تم پچاس مُردے — پہاڑ کے مُردے مہیا کر سکتے ہو؟"

رام دین نے سر کھجا کر اپنی ٹوپی پھر اسی جگہ پر سجالی۔

"آپ کی میڈیکل سائنس تو ہماری سائنس سے بہت آگے نکل چکی ہے صاحب، آپ خود ہی ان سب کا ٹھونک بجا کر معائنہ کر لیجیے آپ کو یقین آجائے گا کہ یہ سب پکے مُردے ہیں۔ ٹھہریے میں آپ کو دوسرے طریقے سے سمجھاتا ہوں"

رام دین گاڑی سے نکل کر اس قطار کی طرف آگیا اور کچھ کہے بغیر اس نے ایک آدمی کے منہ پر زور

سے تھپڑ دے مارا۔

اُس آدمی نے مدافعت کی نہ گالی بکی، بس چپ چاپ جوں کا توں کھڑا رہا گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

رام دین فاتحانہ چال سے واپس امریکی ڈاکٹر کے پاس آکھڑا ہوا۔

"کیا اب بھی آپ کو یقین نہیں آیا کہ یہ سب کے سب سوفی صد مُردے ہیں۔!"

امریکی ڈاکٹر نے سراسیمہ خفگی کے ساتھ اپنے ڈرائیور کو مخاطب کیا: "واپس چلو، ڈرائیور!"

"ٹھہریئے صاحب، میری لمنیے اور انہیں لے جایئے۔ آپ جیسا تجربہ کرنا چاہتے ہیں اطمینان سے ان ہی پر کر لیجیے۔ ٹھہرو ڈرائیور! پیسے چاہیں تو اپنی تسلی کے بعد ادا کیجیے صاحب۔"

"چلو، ڈرائیور!"

"اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے صاحب، ویسے مُردے ہوتے تو آپ کا کارگو کا خرچ الگ ہوتا۔ یہ بے چارے تو آپ ہی اپنا سارا بوجھ اٹھا کر جہاز پر سوار ہو جائیں گے۔"

"چلو، ڈرائیور!"

امریکی ڈاکٹر کی گاڑی آگے بڑھ گئی تو رام دین ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔

"بڑے بدقسمت ہو۔ اگر تم واقعی مر چکے ہوتے تو ٹھاٹ سے امریکہ جا پہنچتے۔"

اسٹاپ

شیام بابو گذشتہ بارہ سال سے تار گھر میں کام کر رہا ہے لیکن وہ ابھی تک یہ بات نہیں سمجھ پایا ہے، یہ بے حساب الفاظ برقی تاروں میں کہیں ٹکرا کیوں نہیں جاتے اور ٹکرا ٹکرا کر اپنی سمجھ بوجھ سے نئے رشتوں میں منسلک ہو کر ریسیونگ اسٹیشنوں پر اسی طرح کیوں نہیں پہنچتے — بیٹے نے ماں کو جنم دیا ہے، مبارکباد' —— یا، چوروں نے پولیس کو گرفتار کر لیا ہے — بے حساب خوشیاں، مردہ بچہ پیدا ہوا ہے — شیام بابو کسی مشین کی طرح میکانکی انداز میں برقی پیغامات کے کوڈ کو رومن حروف میں اتارتا جا رہا ہے اور اس مشین کے اندر ہی اندر ان کھلائی ہوئی سوچوں کا تالاب بھر رہا ہے — کیا مضائقہ ہے؛ جیسے آج بیت رہی ہے،

ہمارے پیغام بھی ویسے ہی کیوں نہ ہوں؛ — کرتا ہوں، اسٹاپ ——————

— تار کے آخری الفاظ اتارتے ہوئے شاید اس نے اپنے آپ سے پوچھا ہے، کیا کرتا ہوں؟ — مجھے کیا کرنا ہے! اتنے ہجوم میں اگر کوئی کسی ایک کو آواز دے تو کیا سارا ہجوم مڑ کر دیکھنے لگتا ہے؛ جس کے نام کا تار ہے وہی پڑھ کر دیکھے گا کر اُسے کیا کرنا ہے — لیکن خلافِ معمول اشتیاق سا محسوس کر کے وہ یونہی اس تار کا مضمون پڑھنے لگا ہے — اپنی شادی روک لو، اسٹاپ، میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں، اسٹاپ — وہ ہنسنے لگا ہے — چٹھی کی طوالت اور تار کا اختصار دونوں کتنی مضحکہ خیز صورت پیدا کر دیتے ہیں — میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں — مانو بیچارہ تھوڑی سی محبت کر کے باقی محبت کرنا بھول گیا اور پھر بات بگڑ گئی تو سب کچھ چھوڑ کر محبت ہی محبت کرنے پر تل گیا۔

شیام بابو لگے تار کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔ کسی کی موت پر دکھ کا اظہار کرنے کے لیے تار گھر کی اسٹینڈرڈ عبارت کے متعلقہ نمبر کی اطلاع فراہم ہوئی ہے، پیسے بھی کم اور دکھ کے اظہار کا ڈرافٹ بھی سرکار کے ذمے، ---- ہاں، جو آپ ہی مر چکا ہو وہ اپنوں کی موت پر کیا دکھ محسوس کرے گا! شیام بابو نے اپنے آپ کو ڈانٹا ہے، کوئی مرے یا جیے، تمہیں کیا؟ چپکے سے اپنا کام کیے جاؤ ---- کام؟ مجھے تو مر کر بھی یہی کام کیے جانا ہے ---- مر کر بھی؟ ---- لو یہ تار پڑھو۔ شاید تمہاری موت کی خبر ہے۔ مبارکباد پیش کرتا ہوں شاباش ---- اس نے جلدی جلدی آتارا ہے اور بے خبر سوچ رہا ہے۔ ٹھیک ہی تو ہے میں زندہ کہاں ہوں! اس کے باوجود مجھے اپنے جسم کی ٹک ٹک چلائے رکھنا ہوتی ہے، نہیں تو مجھے آفس سے اٹھوا دیا جائے گا۔ گھر؟ ---- گھر میں بھی کیا رکھا ہے؟ ---- اسٹاپ۔

شیام بابو کی شادی ہوئے سات آٹھ سال ہو چکے ہیں مگر اس کی بیوی تبھی سے اپنے ماں باپ کے گاؤں میں انھی کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اپنی شادی کے موقع پر وہ اس کی ڈولی اٹھوا کے گاؤں سے باہر لے آیا لیکن پھر جو سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کہاں لے جائے تو اس نے ڈولی کا منہ واپس گاؤں کی طرف پھروا لیا۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا بیٹا!" اس کی ساس نے کہا تھا۔ "جو ایک بار اسے گاؤں سے باہر لے گئے، کم سے کم رسم تو پوری ہو گئی!"

شروع شروع میں تو اس کی بے چینی کا یہ عالم تھا کہ سوتے میں بھی بیوی کے گاؤں کا رخ کیے ہوتا ---- تم گھبراؤ نہیں، ساوتری، جونہی کوئی اچھی سی بھاڑے کی کھولی مل گئی، اسی دم تمہیں یہاں لے آؤں گا، لیکن برا ہو کس اتنے بڑے شہر کا، اتنا بھی دل نہیں کہ انہیں اکٹھا رہنے کے لیے ایک ہی کمرے کا چھوٹا سا گھر دے دے۔ پورے ساڑھے سات برس اسی طرح گذر گئے ہیں، میں یہاں اور وہ ساڑھے پانچ سو میل پر وہاں۔ پہلے پہل شیام بابو بیس کم تین سو پینسٹھ دن اپنی بیس دن کی اینڈ لیو کا انتظار کرتا رہتا اور وقت آنے پر ریل گاڑیوں، بسوں اور اکوں کو بدل بدل کر اپنی بیوی کے گھر آ پہنچتا اور اس کی خواہش اتنی شدید ہوتی کہ سچ مچ کر تیار بیٹھی بیوی کو بے اختیار گلے لگاتے [illegible] سینہ رک جاتی اور شرمندگی سے مسکراتے ہوئے وہ گویا اپنی کسی دفتری غلطی پر ذرا سا سر جھٹک دیتا۔

ایک ---- دو ---- تین سال تو شیام بابو ہر سال اپنی بیوی سے ملنے گیا لیکن چوتھے سال عین چھٹی کے دنوں میں بیمار ہو گیا، پھر [illegible] سال جو جاتا ہوا تو اس کے بعد پورے ڈھائی سال نہ جا پایا ---- جو پیسے [illegible] ہوں گے اس سے [illegible] اس مہینے زیادہ منی آرڈر کروا دوں گا تو اس بھلی لوگ کے بیسیوں [illegible] گے ---- [illegible] ہے جس کے بارے میں اس کی بیوی نے لکھا تھا کہ وہ [illegible] سال کے دوران [illegible] آیا تھا لیکن شیام بابو سارا حساب کتاب کر کے اس [illegible] کا بیٹا اس کا [illegible] شاید اس وجہ سے بھی ان ڈھائی سال میں وہاں نہ

گیا تھا؛ تاہم اس نے اس سلسلے میں اپنی بیوی کو کچھ نہ لکھا تھا، جو ہے سو ٹھیک ہی ہے۔ وہ بیچاری بھی کیا کرے؟
اور ـــ میں بھی کیا کروں۔ کبھی اچھے دن آ گئے تو سب کچھ اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا، اُسے اور اس کے ـــ ہمارے بچے کو یہیں اپنے پاس لے آؤں گا اور پھر ہم چین سے بسر کریں گے ـــ بڑے چین سے! ـــ

"شیام بابو! ـــ شیام بابو ـــ!"

اس کے دفتر کا کوئی ساتھی اس کا کندھا جھنک رہا ہے۔ مشین میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے اور رُکی پڑی ہے۔

شیام بابو!

"آں ـ ں ـ!" اس نے ہڑبڑا کر اپنی آنکھیں کھول لی ہیں۔

"طبیعت خراب ہے تو گھر چلے جاؤ۔"

کون سے گھر؟ ـــ نہیں، ٹھیک ہوں! ـــ یونہی ذرا اونگھ آ گئی تھی ـــ ٹک ٹک ـــ ٹک ـــ! مشین پھر چلنے لگی۔

"تمہارے لیے پانی منگواؤں؟"

"ارے بھائی، کہہ دیا نا، ٹھیک ہوں۔"

اس کے ساتھی نے حیرت سے اس کے کام پر جھکے ہوئے سر کی طرف دیکھا ہے اور پھر اپنے کام میں اُلجھ گیا ہے
شیام بابو کو اپنا جی اچانک بھرا بھرا لگنے لگا ہے

عام طور پر یونہی ہوتا ہے کہ اسے اپنی خوشی کی خبر ہوتی ہے نہ غم کی، وہ جیسے بھی ہوتا ہے بے خبری میں ہی ویسے ہوتا ہے۔ اُسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور یوں سب کچھ ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ بے خبر سا اپنے آپ اپنے دفتر میں آ پہنچتا ہے اور سارا دن قلم چلا چلا کر ٹھکانے پر لوٹ آتا ہے اور پھر دوسرے دن ویسے ہی ڈیوٹی پر آ بیٹھتا ہے اگر کوئی خاص اسی کے بارے میں سوچتے ہوتے عین وہیں نہ دیکھے جہاں وہ بیٹھا ہو تو اُسے اس کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہو۔ اس دن تو حد ہو گئی۔ اس کا باس اُس کے پاس ہی کھڑا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ بھئی، شیام بابو کہاں ہے۔
ـــ شیام بابو! ـــ شیام ـــ! ـــ شیام بابو اس کے پہلو میں ہی اپنی سیٹ پر پورے کا پورا موجود تھا مگر اپنے باس کو نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ یقینی طور پر اس کی آواز سن رہا ہوگا، لیکن واقعی سن رہا ہوتا تو فوراً کھڑے ہو کر جواب کیوں نہ دیتا ـــ یس سر! ـــ ایسے بھولے بھٹکے چہرے شاید آنکھوں میں ٹھہرنے کی بجائے ہماری روحوں میں اٹک جاتے ہیں۔ ان سے مخاطب ہونا ہو تو اپنی ہی تھوڑی سی جان دے کر انہیں زندہ کر لینا پڑتا ہے، ورنہ وہ آپ وہاں کہاں!

گوشت کو رگوں میں خون دوڑنے کی اطلاع ملتی رہے تو وہ زندہ رہتا ہے، نہیں تو مٹی ہوتا جاتا ہے۔
جب شیام بابو کی اپنی زندگی بے پتا م ہے تو اُسے کیسے محسوس ہو کہ ٹیلی گراموں کے ٹیکسٹ برقی کوڈ کی اوٹ

میں نہس رہے ہیں، رو رہے ہیں یا گم صم پڑے ہیں، ہری ہری مٹی پر کچھ بھی لکھ دیجیے، اُسے کیا ؟ شیام بابو کو اس سے کیا، کہ کوئی کیسے کیا پیغام بھیج رہا ہے۔ اس کی قسمت میں تو کسی کا پیغام نہیں، محبت کا یا نفرت کا، خوشی یا غم کا ؟۔ اُس کی بیوی ؟ ــــ ہاں، وہ اسے ہر ماہ باقاعدگی سے اپنی تنخواہ کا ایک تہائی بھیج دیتا ہے اور وہ اُسے پیسوں کے پہنچنے کی خبر کر دیتی ہے اور اُس کے ساتھ وہی ایک فالتو سا جملہ لکھ کر کچھ اس طرح اپنے پاس بلاتی ہے جیسے کہہ رہی ہو، آسکتے ہو تو آجاؤ، اور نہیں آسکتے تو ہماری فکر مت کرو، ہم سب پوری خیریت سے ہیں ــــ پوری خیریت کیا یہی ہوتی ہے ؟ ــــ شیام بابو کا جی بہت بھر آیا ہے ــــ اشاپ، میں بدیس سے لوٹ آیا ہوں اشاپ ــــ اس نے اپنا سر اُٹھا کر دیکھا ہے کہ صاحب کا چپراسی اس کی طرف ایک سرکاری لیٹر بڑھا رہا ہے اُس نے خط لے کر اس پر نظر دوڑائی ہے اور پھر چونک کر خوشی سے کانپتے ہوئے اسے دوبارہ پڑھنے لگا ہے۔ اُسے اطلاع دی گئی ہے کہ تمہارے نام دو کمروں کا کوارٹر منظور ہو گیا ہے۔ کیدار بابو ! ــــ کشن ! ــــ دیکھو ! ــــ دیکھو ! ــــ

"کیا ہے بھائی ؟ "

"میرا کوارٹر منظور ہو گیا ہے ؟ "

"اچھا !"

"یہ تو بہت اچھا ہوا شیام بابو"

"شیام بابو، سب کے لیے چائے ہو جائے"

"چائے ہی کیا، کچھ ادھار دے سکتے ہو تو کھانے کے لیے بھی جو چاہو منگوالو"

"ہاں، بے فکر مت کرو۔ میں سارا بندوبست کیے دیتا ہوں۔ ارے او رامو ! ــــ ادھر آؤ رامو، باہر وہ ہوٹل والا ہے نا، اُسے بلالاؤ ! ــــ اب بھابی کو کب لا رہے ہو شیام بابو ؟ "

"آج ہی چھٹی کی درخواست دے دوں گا"

شیام بابو جی ہی جی میں اپنے کوارٹر میں بیٹھا کھلا کھار ہا ہے۔ اور اُس کے کندھوں پر اس کا لڑکا کھیل رہا ہے ــــ کیا نام ہے اس کا ؟ ــــ دیکھو نا دماغ پر زور ڈالے بغیر اپنے اکلوتے بچے کا ــــ اپنا ہی تو ہے ــــ نام بھی یاد نہیں آتا ــــ اری سن رہی ہو بھلی لوگ ؟ اگلی چپاتی کب بھیجو گی ؟ دفتر کو دیر ہو رہی ہے۔

"لو شیام بابو، ہوٹل والا تو آگیا ہے ــــ ہر ایک کے لیے ایک چائے، ایک گلاب جامن اور ــــ ایک سموسہ ــــ چلے گا نا شیام بابو ؟ "

شیام بابو کو پتہ ہی نہیں چلا ہے کہ دفتر میں بقیہ سارا وقت کیسے بیت گیا ہے۔ وہاں سے اُٹھنے سے پہلے اس نے اپنے ساتھیوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان سب کو اُن کی بھابی کو تصویر دکھائے گا۔ اتنی بھولی ہے کہ ڈرتا ہوں اس شہر میں کیسے رہے گی ؟ "

" ڈرو نہیں شیام بابو — بھابی کولانا ہے تو شیر ببر بن کر رہو "

" ہہ ہاہہ — ہہ ہاہہ — ! "

دفتر کے باہر سڑک پر چھ بجے سے ہی اندھیرا چھانے لگا ہے۔ شیام بابو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے یہاں چوراہے پر آگیا ہے اور پان اور سگریٹ لینے کے لیے رک گیا ہے اور پھر تمباکو والے پان کا لعاب حلق سے اتارتے ہوئے نتھنوں سے سگریٹ کا دھواں بکھیرتے، ہلکی ہلکی سردی میں حدت محسوس کرتے وہ بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ اپنی رہائش کے اڈے کی طرف ہولیا ہے —— ایک چھوٹی سی کھولی، جس میں مشکل سے ایک چارپائی آتی ہے ابھی پچھلے ہی ماہ خان سیٹھ نے اُسے دھمکی دی تھی کہ بھاڑے کے دس روپے بڑھاؤ، یا خالی کردو

" چوبے کے اس بل کے پہلے ہی پچاس روپے وصول کرتے ہو خان سیٹھ۔ اپنے خدا سے ڈرو۔ "

لیکن خان سیٹھ نے گویا اپنے خدا کو ڈرانے کے لیے ایک قہقہہ لگایا۔

اسی مہینے خالی کردوں گا۔ یہ کھولی اپنی، خان سیٹھ۔ تمہاری قبر کے پورے سائز کی ہے — سنبھالو — نہیں جھگڑے وگڑے کا کیا فائدہ؟ چپکے سے اس کی کھولی اُس کے حوالے کرکے اپنی راہ لوں گا۔ بس اسٹاپ آگیا ہے اور بس بھی کھڑی ہے۔ لیکن بہت بھری ہوئی ہے۔ شیام بابو نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ پیدل ہی جائے گا۔ یہاں سے ایک ہی کلومیٹر تو ہے —— اُس کی سگریٹ جل جل کر انگلیوں تک آپہنچی ہے لیکن ابھی تک اُس کی اشتہا جوں کی توں ہے اُس نے ہاتھ کا ٹکڑا پھینک کر ایک اور سگریٹ سلگائی ہے —— ساوتری کو میرا سگریٹ پینا بالکل پسند نہیں ہے۔ پھیپھڑے بھی جلاتے ہو اور پیسے بھی اس سے تو اچھا ہے میرا ہی ایک سرا جلا کر دوسرے کو ہونٹوں میں دبالو اور دھواں چھوڑتے جاؤ — میرا مزہ کیا سگریٹ سے کم ہے؟ —— اری بھلی لوگ تمہارا ہی تو ایک مزہ ہے۔ سگریٹ وگریٹ کی لت کو گولی مارو۔ آؤ! —— شیام بابو نے خیال ہی خیال میں بیوی کو سینے سے لگالیا ہے اور راستے میں مخالف سمت سے آتی ہوئی ایک عورت سے ٹکرا گیا ہے اور اسے لگتا ہے جیسے اُس کی ساوتری نے اُس سے الگ ہونے کے لیے اپنے آپ کو جھٹکا دیا ہے — ارے! — اس نے اندھے پن میں اپنا ہاتھ اس عورت کی طرف پھیلا دیا ہے — ایڈیٹ! — وہ عورت غصے سے پھنکارتی ہوئی آگے بڑھ گئی ہے اور شیام بابو شرمندہ ہو جانے کے بجائے بدستور خوش خوش ہے اور عورت کی پیٹھ کی طرف منہ لٹکا کر اس نے باآواز بلند کہا ہے۔ آئی ایم ساری میڈم! —— شیام بابو اپنے ذہن کو جھاڑ رہا ہے اور اُڑتی ہوئی گرد میں اُس کی بیوی زور زور سے ہنس رہی ہے —— اور ٹکراؤ پرائی عورتوں سے! ایک میں ہی تو ہوں جو بلا روک ٹوک سب کچھ کرلینے دیتی ہوں کسی اور کی طرف ذرا نظر اُٹھا کے تو دیکھو —— کسی اور کی طرف مجھے دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بھلی لوگ۔ میرے لیے تو بس ایک تم ہی ہو — شیام بابو نے اپنے آپ کو پھٹکار کر سمجھایا ہے، نہیں تم نے اپنی بیوی کے ماتھے پر خواہ مخواہ کلنک کا ٹیکا لگا رکھا ہے۔ تمہارا بچہ تمہارا ہی ہے —— اور اگر مان بھی لیں کہ تمہارا نہیں، تو اس میں ساوتری کا کیا دوش۔! اس کا سارا سال تمہاری انڈیمو کے دس میو۔

کاتو نہیں ـــ چلو، سب ٹھیک ہے۔ میرا بچہ میرا ہی ہے۔ ہمارے بیٹو کی آنکھیں بالکل تمہاری آنکھوں جیسی ہیں شیام ـــ چھوٹی چھوٹی۔ ماتھا مجھ پر گیا ہے لیکن ٹھوڑی تمہاری ہے ـــ چلو، سب ٹھیک ہے۔ میں بھی کیسا باپ ہوں۔ بیٹا دو سال کا ہو لیا ہے مگر میں نے اُسے ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ پچھلے سال مجھے ایک چکر کاٹ آنا چاہیے تھا ـــ آج چھٹی کی درخواست دے آتا تو بہتر ہوتا۔ اب کل پہلا کام یہی کروں گا اور اس ہفتے کے آخر میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔ چھٹی کے بغیر اچانک اس کے سامنے جا کھڑا ہوں گا ـــ ساوتری! ـــ اور وہ آنکھیں مل مل کر میری طرف دیکھتی رہ جائے گی ـــ ساوتری! ـــ اُسے لگے گا کہ وہ کھلی آنکھوں سے سپنا دیکھ رہی ہے اور ـــ وہ بے اختیار رو دے گی ـــ اٹھتے بیٹھتے تمہاری ہی صورت دکھائی دیتی ہے۔ اب تو آ جاؤ! ـــ اور میں آگے بڑھ کر اُسے گلے لگا لوں گا اور وہ میرے بازوؤں میں بے ہوش ہو جائے گی ـــ ساوتری! ـــ اپنی کھولی کے سامنے پہنچ کر شیام بابو نے بے قابو ہو کر اپنی بیوی کو پکارا ہے، لیکن وہاں اس کے تار گھر کے رامو نے آگے بڑھ کر اسے جواب دیا ہے۔ "بابو جی ـ؟"

"ارے رامو، تم؟" شیام بابو حواس درست کرنے لگا ہے۔

"کیسے آئے؟"

"بابو جی" رامو کی آواز بھاری ہے اور وہ بولتے ہوئے تامل برت رہا ہے۔

"اتنے اُکھڑے اُکھڑے کیوں ہو؟ ـــ بولو نا؟"

"آپ کا تار لایا ہوں"

"میرا تار؟"

"ہاں بابو جی، یہ تار آپ ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، پر آپ کا دھیان نہیں گیا کہ آپ کا ہے"

تار پڑھنے کے لیے شیام بابو تار کا لفافہ تیز تیز چاک کر رہا ہے ـــ ساوتری نے خودکشی کر لی ہے اسٹاپ۔

کایا کلپ

بھونکو مت، ٹائیگر! بھونک بھونک کر تو تم نے یہ ساری مصیبت کھڑی کی ہے ـــــ ہاں بھائی، بھونکنے کی بات ہو تو بھونکنے کو جی تو چاہتا ہے مگر پہلے آگے پیچھے تو دیکھ لینا چاہیئے ـــــ میں؟ ـــــ نہیں میری اب کون سنتا ہے ٹائیگر بیٹے۔ تمہارا اور میرا ـــــ ہم دونوں کا مالک اب میرا بیٹا ہے۔ تم تو بھونک بھونک کر چودہ برس میں ہی بوڑھے ہو گئے ہو مگر میں پچھلے چوالیس برس سے اُس کی خدمت گزاری میں لگا ہوا ہوں۔ اگلے مہینے پورے ستر برس کا ہو جاؤں گا۔

کیسا؟ ـــــ تمہیں اپنی پرانی باتیں سناؤں؟ وہی تو ہر روز سناتا رہتا ہوں ٹائیگر۔ اچھا، اچھا، اچھلو نہیں، ورنہ اس عمر میں کوئی ہڈی توڑ بیٹھے تو جُڑنے میں نہ آئے گی ـــــ آرام سے بیٹھ جاؤ، سناتا ہوں ـــــ آج نہ جانے میرا پرانا محلہ کیوں بار بار میری نظروں میں جوں کا توں گھوم رہا ہے، جیسے ہم اس میں گھوما کرتے تھے ـــــ ہاں، ٹھیک کہتے ہو ٹائیگر، پناہ گاہیں خیال میں بھی باقی نہ رہیں تو آدمی بھاگ بھاگ کر جائے گا کہاں؟ ـــــ ہم سارے محلے والے ـــــ کُتے، بلیاں، آدمی ـــــ سبھی ایک جان ہو کے اپنے محلے کے وجود میں خون کی طرح گردش کرتے تھے اور اُس کے دل سے گزر گزر کر ہر لحظہ پاک وصاف ہو جاتے تھے اور ـــــ نہیں، ٹوکو نہیں ـــــ اور پاک وصاف ہو کر اُس کے چہرے میں دمکتے رہتے تھے ـــــ

اس قدر ہانپ کیوں رہے ہو ٹائیگر؟ ـــــ خوشی سے؟ کس بات کی خوشی؟ میں نے سوچا، شاید تم بھانپ گئے ہو کہ ـــــ کہ ـــــ نہیں، بات کیا ہوئی ہے؟ ـــــ تمہیں اس طرح ہانپتے ہوئے پاکر میں یونہی ڈر سا گیا تھا۔ خوشی سے کبھی اتنی ہانپ ہونے لگے پاگل، تو دم اُڑ جاتا ہے۔ سہج سہج خوش ہوا کرو ـــــ ہاں، ہاں، صبر کرو۔ اپنے محلے کی بات ہی تو کر رہا ہوں ـــــ ہاں، تو ہم اپنے محلے کے وجود میں خون کی طرح

دوڑے پھرتے تھے۔ بدن جیسے کبھی نہ اپنے خون سے ہی بنتا ہے۔ مانو ہم آپ ہی آپ اپنا خوب صورت قلعہ تھے
—— کیسے ؟ —— ایسے، ہائے، کہ جسم کو جان سے جدا کر دیا جائے تو باقی رہ ہی کیا جاتا ہے ! ——————
تمہارا ویسٹ وے اسٹریٹ کا یہ سی بلاک ! تمہارے اس بلاک میں بھیڑ بھاڑ میں دم تو گھٹتا ہے مگر کتنا خالی
خالی ہے ! ایک شخص بھی نہیں جسے کوئی بلا جھجک گلے لگائے —————— تم ؟ ——————
میں تمہارا ذکر تھوڑا ہی کر رہا ہوں۔ تم تو اپنے پنجوں سے کھرچ کھرچ کر میرے ذہن کی ساری کثافتیں صاف
کر دیتے ہو تم بھی نہ ہوتے تو اپنے ہی باطن میں میری بو دو باش دو بھر ہو جاتی —— میں تمہاری بات نہیں

اوروں کو چھوڑو، میرے پوتے کو ہی دیکھو۔ کل مجھے اس پر ذرا پیار آنے لگا تو میں نے جھجک جھجک کر اسے
اپنی چھاتی سے چمٹا لیا، مگر چھو کر اسے جھٹکتے ہوئے چلانے لگا، چھوڑو، گرینڈ پا، چھوڑو مجھے —— سانس کیسے
لوں ؟ —— بھڑ واڑیوں کا دودھ پی پی کر اونچا ہو رہا ہے، اسے کیا معلوم ہے ممتا سانس لیے جانے سے ہی جینا
نہیں ہو جاتا —— میں نے سوچا، ابھی بچہ ہے، اور بولا، آؤ، باہر پارک میں جا کے کھلی ہوا میں کھیلتے ہیں ——
جھٹ کر جواب دیا، میرے پاس کھیلنے کو ٹائم نہیں ! —— ساری عمر باقی پڑی ہے مگر ابھی سے ٹائم کا حساب
رکھنا شروع کر دیا ہے۔ اپنے ماں باپ کا ہی سدھا ہوا ہے۔ وہ بھی سمجھتے ہیں ٹائیگر، کہ صرف ٹائم کو جوڑ جوڑ کر ہی
آدمی لاٹاقی ہو جاتا ہے، یعنی جیو نہیں، جینے کی گھڑیاں جمع کرتے کرتے مر جاؤ ! —— ہاں، ہاں، جی بھر کے
بھونک لو۔ مجھے معلوم ہے بھونک بھونک کر تم بے اختیار ہنس رہے ہو۔ ہنس لو، بیٹا، جتنا وقت باقی ہے
خوب ہنس لو، نہیں تو —— نہیں، میرا مطلب صرف یہ ہے کہ اپنی عمر تو ہم بھوگ ہی چکے ہیں، باقی وقت ہنستے
میں بیت جائے تو اس سے اچھا اور کیا ہے ؟ ——
ہمارے محلے میں ہنسنے ہنسانے کا کوئی موقع ہوتا تو سبھی لوگ اپنے سارے کام چھوڑ کر باہر گلی میں
نکل آتے —— سنو، تمہیں ایک مزیدار قصہ سناتا ہوں —— ایک بار ہولی کے دن آسمان میں بادلوں
کے ان گنت ٹکڑے آپس میں کھیل رہے تھے کہ اچانک قہقہوں کی موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ہم بھی رنگوں
کی بالٹیاں لیے دوڑتے ہوئے باہر گلی میں آ گئے۔ گیری چاچی تھی منہ پر توے کی کالک مل کر اپنے کالے انجنگ
شریر ادھو کے ساتھ قہقہاتے لوگوں میں تھرکی تھرکی تھی، اور منگلا چاچی سے کہہ رہی تھی، چاچی، تمہارا لاڈلا ادھو
ہنستے ہنستے مجھے ایک کالا رنگ ہی بھاتا ہے —— سچ ہے جو ٹائیگر، مکھن عورت نے اپنا منہ کالا کر لیا کہ
چھچھا پیچھا نہ بچائے —— اور جلتے ہو گیا، ادھو بھوکے بھوکے شنکر کی جے بول کر سب کے سامنے اپنی
چھچھی گنے کیا ہے اپنے ہونٹ آدھے کر لیے —— تم گیری ہو گئی تو کیا ؟ تمہارا من تو میری ہی گاڑھی
ننگی مچی ہے —— اور پھر ہم سب نے اپنے رنگوں کی پچکاریاں بھر کر انہیں اپنے نشانے میں
لے لیا —— ادھر ہماری رنگ بھری صدا ہر کھوہ آسمان میں گونجی، ادھر آسمان بھی بے اختیار

قہقہاتے ہوئے ہم پر ساتوں رنگ برسانے لگا۔

رُکو نہیں، ٹائیگر، دل کھول کر بھونک لو، تمہارا تو ہنسنا رونا، پیار کرنا غصے میں آنا ـــــ سب کچھ ایک بھونک بھونک کر ہی ہوتا ہے۔ مشکل بیچارے آدمی کی ہے۔ جی رو رہا ہوتا ہے مگر ہنستے چلے جاتا ہے۔ ہنستے ہنستے رونے کی خواہش کو دبا کر اس کی جان حلق میں پھنسی ہوتی ہے ـ ٹھہرو، پہلے پانی کے ساتھ ڈاکٹر کی گولی اُتار لوں ـــــ گولی نہ کھاؤں ٹائیگر، تو جان کو واپس اپنی جگہ پر کیسے دھکیلوں؟ ـــــ کیسا تمہیں بھی میرے ہنسنے میں رقّت کا احساس ہوتا ہے؟ ـــــ سچ کہوں ٹائیگر؟ میرا جی چاہ رہا ہے پھوٹ پھوٹ کر رو لوں ـــــ نہیں، ہوا تو کچھ نہیں، یونہی پرانی باتوں کی یاد سے جی بھر آتا ہے ـــــ اتنی پرانی باتیں ہیں اور بار بار کھولنے سے تار تار ہو چکی ہیں اور ہر بار کوئی نہ کوئی تار ٹوٹ جاتا ہے اور ٹوٹ کر پھر یاد آنے میں نہیں آتا۔

نہیں، ٹائیگر۔ مجھے اس پھٹے پُرانے تانے بانے میں ہر دم منہ چھپا کر پڑے رہنا پسند نہیں۔ میری طرف دیکھنے کی کسی کو فرصت ہو تو نصف صدی پرے آنکھ جھپکنے میں ادھر چلا آؤں اور سدا یہیں رہوں۔ خیالوں ہی خیالوں میں کلیجے میں ٹھنڈک تھوڑا ہی آتی ہے، مگر جہاں بڑھوں پر اس طرح نظر اٹھائی جائے کہ ملبے کا ملبہ پڑا ہے، وہاں کیا اپنی بُو سونگھنے کو پڑا رہوں؟

ہمارے محلے میں ہمارا بڑا چاچا ہوا کرتا تھا ٹائیگر ـــــ سو نہیں، کھوسٹ، تمہارے ایسے ہی لچھنوں سے تو ساری مصیبت کھڑی ہوئی ہے۔ آنکھیں کھول کر میری باتیں سنو، نہیں تو تمہارے کان مڑ کر تمہارے اندر کی طرف جا کھلیں گے اور پھر اپنے آپ کو نہ جانے کیا الم غلم سناتے رہو گے ـــــ ہاں، بھونکتے بھونکتے تم اچانک سو گئے تھے۔ شاید سوتے سوتے بھی دو ایک بار بھونک دیے تھے۔ اپنی باتوں میں پھر تمہاری طرف دھیان ہی نہ گیا ـــــ ہاں، میں تمہیں اپنے محلے کے بڑے چاچا کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اپنی پیدائش سے میں اسے اتنا ہی بوڑھا دیکھ رہا تھا۔ میری ماں کا بھی کہنا تھا کہ جب اُسے بیاہ کر لایا گیا، بڑا چاچا تب بھی اتنا ہی بوڑھا دکھائی دیتا تھا ـــــ نہیں، کسے معلوم اس کی کیا عمر تھی؟ عمروں کا حساب تو اس وقت رکھا جاتا ہے جب عمر کے اگلے سِروں کی ٹوہ ہو۔ یہاں تو یہ تھا کہ جو پیدا ہوا وہ گویا پہلے سے ہی ہمارے ساتھ تھا اور جو مر گیا، وہ بھی ہمیں چھوڑ کر کہاں جائے گا۔ میری ماں جب میرے دادا مرحوم کا شرادھ کیا کرتی تھی تو تو اپنے سامنے کھانے کی چوکی پر بیٹھا ہوا براہمن اسے اپنا سُسر ہی معلوم ہونے لگتا اور وہ لمبا سا گھونگھٹ اوڑھے بار بار اس کی تھالی میں گرم گرم پوری رکھ دیتی، بس سہا پتاجی، یہ آخری لے لیجیے!۔

مگر ایک بیماری ہو ہے، ٹائیگر، کہ ہمارے جیتے جی بھی اُسے خبر نہیں، ہم کھا کے جیتے ہیں یا کھائے بغیر! ـــــ کبھی دیکھنے میں ہی نہیں آتی، بس اس کی طرف سے حیرت ملتی رہتی ہیں کہ بابا سٹھیا گیا ہے تم ہی بتاؤ، ستر کی عمر میں کوئی سٹھیائے گا بھی نہیں؟ ـــــ کہتی ہے ٹائیگر، میں نے تمہیں بُری طرح بگاڑ رکھا ہے

میری طرف منہ پُھلا کے بھونکنا کیوں شروع کر دیا ہے ؟ میں تھوڑا ہی کہتا ہوں تم بگڑے ہوئے ہو۔ اپنی اس ماں کو بھونکا کرو۔ مگر یہ بھی تو تم کرتے ہو ــــــ دیکھو، ٹائیگر، وہ کہیں نظر آجائے تو سر نیچے کرکے ایک طرف ہٹ جایا کرو۔ تمہیں اس سے کیا لینا دینا ہے ؟ ــــ

اچھا، یہ بتاؤ اُس دن صبح آنکھ کھلتے ہی دُم ہلاتے ہوئے اُس کے بیڈ روم میں کیوں جا گھسے ؟ وہاں تو وہ اپنے بیٹے کو بھی نہیں آنے دیتی۔ تمہاری جھریوں میں تو اُسے اپنے باپ لٹکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ــــ کیا بولتی تھی تمہیں شوٹ کروا دے گی ؟ ــــ کوئی مذاق ہے ! ایسی ویسی بات ہوئی تو میں اُسے پھانسی پر چڑھوا دوں گا ــــ مگر نہیں، ٹائیگر، تم اس سے بچ کر ہی رہا کرو۔ اپنے آرام کے لیے جب یہ لوگ کتوں کو مروا دیتے ہیں تو اسے مرسی کلنگ کا نام دیا جاتا ہے اور مروانے والے کو پھانسی چڑھانے کی بجائے عزت سے دیکھا جاتا ہے ــــ ہاں بیٹے، اس سے بچ کر ہی رہا کرو۔ ساری عمر ان کی چوکیداری میں بتا چکے ہو۔ اب اپنی چوکیداری کیا کرو، نہیں تو چور تمہیں ہی تم سے چھین لیں گے ــــ نہیں، بھونکو نہیں ــــ تمہیں اِدھر اُدھر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ ــــ میں نے کہہ دیا نا، بھونکو نہیں، بھونک بھونک کر تو تم نے ساری مصیبت کھڑی کی ہے ــــ بھلے کبھی اُدھر ان کے پاس جاتے ہوئے دیکھا ہے ؟ تم بھی یہیں پڑے رہا کرو۔ یہاں تو یہ ہے ٹائیگر، کہ مرنے سے اپنے الگ الگ کمرے میں زندگی کی قید بھگتے رہو۔ ہمارا محلہ ؟ ـ ہمارے محلے کی کیا پوچھتے ہو ؟ وہ تو ہر طرف سے کھلا ہوا تھا۔ جدھر سے جہاں بھی پہنچ جاؤ گویا اپنے ہی پاس آ پہنچو اور بے فکری سے آنکھیں موند لو کہ ماں کی گود میں آ پڑے ہو ــــ ہاں، میں تمہیں بڑے چاچا کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ہر ایک کا کہنا تھا کہ بڑا چاچا سر پہ ہے تو ہمیں کیا فکر ؟ بڈھوں کو ان کی بڑی عمر نہیں مارتی عمر سے تو اعتبار عطا ہوتا ہے۔ ہمارا بڑا چاچا کسی بیمار پر دم پھونک دیتا تو وہ اپنے اِسی ایمان سے تندرست ہونے لگتا کہ بڑے چاچا نے چھو لیا ہے، اب بیماری کا کیا کام ؟

ہمارے بڑے چاچا نے محلے کے ہر جیو کو مالا میں پرو کر اپنے گلے میں پہن رکھا تھا اور کہا کرتا تھا کہ میرا دل اب اس عمر میں اپنے آپ نہیں دھڑکتا بلکہ سونے کے ان ہی منکوں میں سے کوئی نہ کوئی ہر وقت یہاں بجتا رہتا ہے۔

پر تمہارے چند منکوں میں کھوٹ زیادہ ہی ہے بڑے چاچا۔

پھر بھی سونے کے ہیں، جھوٹے تو نہیں۔

بزرگوں کی ٹھہری ٹھہری محبت سے ہی زندگی کے رشتے گٹھتے چلے جاتے ہیں، ٹائیگر۔ جہاں بڈھوں کا مان نہیں، وہاں جینا اور جڑنا کیسے ہو ؟ تمہارے مالک اور مالکن ایک تم ہی سے نہیں چڑے رہتے، وہ آپس میں بھی اپنی مسکراہٹوں کا حساب کتاب ہی چکاتے ہیں۔ تمہیں معلوم نہیں، بہو نے قانونی چارہ جوئی سے میرے بیٹے کی بزنس پراپرٹی میں آدھا حق منوایا تھا۔ وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے تو نہیں مگر صرف اصول اور

قاعدے کی سہولتوں سے جیتے ہیں۔ تم خواہ مخواہ اپنی محبتوں کی توقع پوری نہ ہونے پر بھونکتے رہتے ہو۔
پرسوں وہ پورے ڈھائی ماہ بعد مجھ سے ملا ــــ ہاں، میرا بیٹا ــــ اور چھوٹتے ہی بولا، تمہارا ٹائیگر اب بوڑھا اور پاگل ہوگیا ہے بابا ــــ میں نے کہا ــــ بوڑھا اور پاگل تو میں ہوگیا ہوں بیٹے۔ وہ تو ابھی تمہارے بچے کی عمر بھی نہیں جیا۔ اس سے محبت کرو، جانور کے سارے حواس اپنے آپ پلٹ آئیں گے ــــ مشین کچھ محسوس کیے بغیر چلتی رہی، میرے پاس محبت وجنت کا ٹائم نہیں بابا، مجھے اب اس سے چھٹکارا ہی پانا ہے ــــ تم پریشان کیوں ہوتے ہو ٹائیگر؟ وہ مجھ سے بھی چھٹکارہ پانے کی سوچ رہا ہے ــــ ہاں، جی بھر آیا ہے تو رونا روکو نہیں، بھونک لو ــــ خوب بھونک لو مگر گھبراؤ نہیں۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا ــــ

ایک بات بتاؤں؟ ــــ ہمارے بڑے چاچا کے سونے کے منکوں میں پانچ ــــ نہیں، چھ کتے بھی تھے۔ ہماری ساری گلی انہیں پالتی تھی۔ بڑا چاچا آدمیوں پر بھی بھروسہ کرتا تھا مگر آدمیوں سے زیادہ اسے کتوں پر بھروسہ تھا۔ ان کتوں میں سے گنگارام بہت بوڑھا تھا ــــ نہیں، تم ابھی اتنے بوڑھے کہاں ہوئے ہو؟ اپنے بڑھاپے کے ذکر پر چڑھ مت جایا کرو۔ اسی لیے تو کتوں کی کایا اتنی جلدی ڈھیلی پڑنے لگتی ہے ــــ ارے بھائی، بوڑھے تو ایک نعمت سے کم نہیں۔ بڑا چاچا جب میرے سامنے جوں کا توں گھومنے پھرنے لگتا ہے تو میری جوانی لوٹ آتی ہے۔ بڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں ہمیں ہمیشہ ہرا بھرا رکھتی ہے۔ نہیں ٹائیگر، یہ غلط ہے کہ ماہ وسال ہمیں بوڑھا کرتے ہیں۔ بوڑھے ہم اس وقت ہوتے ہیں جب ہمارے باپ دادا نہ رہیں، ہاں، اپنے آپ میں نہ رہیں یا ہمارے دل ودماغ میں۔ پودے اپنی جڑوں پر کان رکھے ہوتے ہیں ــــ ہاں، ٹائیگر، میرا بیٹا اسی لیے سوکھا جا رہا ہے۔ اپنے دھندوں اور روگوں کے سوا اسے کوئی فکر ہی نہیں، سو روگ پلتے اور دھندے بڑھتے جا رہے ہیں اور وہ آپ گھٹتا جا رہا ہے ــــ دعائیں تو میں اسے پھر بھی دیتا ہی رہتا ہوں مگر وہ میری دعاؤں پر کان دھرے اور انہیں اپنے خون میں رچنے بسنے دے، تب نا ــــ میری دعاؤں کو گوں گوں کرتا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے نکھر آئے ــــ کئی بار آپے سے باہر ہوجاتا ہوں مگر لوٹا پھوٹا ہی سہی، اپنا ہی آپا ہے، اس سے باہر کیسے رہوں ــــ ایک دن میں نے اس سے شکایت کی، گوپال بیٹا، میری ہی انگلی پکڑ پکڑ کر چلنے کے قابل ہوئے ہو ــــ مذاق اڑاتے ہوئے بولا، اب تو تم چل پھر نہیں سکتے، بابا، کیا تمہاری انگلی پکڑ کر سارا دن تمہارے ساتھ بیٹھا رہوں؟ ــــ میں یہ تو نہیں کہتا ٹائیگر، کہ وہ ہردم میرے پاس بیٹھا رہے مگر یہ بھی کوئی جینا ہے کہ تمہارا لینا دینا ہولیا۔ بس اب صرف اس لیے جیتے رہو کہ ایک مرنا باقی ہے۔

ہاں، گنگارام کو تو میں بھول ہی گیا ــــ قدرت بڑی سخی ہے ٹائیگر، کہ بڑھاپے میں سب کچھ چھٹ

سے بھول جایا کیجئے۔ اگر سب تو دماغ سے کانٹے نکال نکال کر بوڑھے پاگل ہو جائیں ـــ نہیں، گنگارام تو
مجھے بھول بھول کر یاد آتا ہے ـــ ہاں، گنگارام بے حد بوڑھا تھا۔ بڑے چاچا کے گھر کے سامنے بیٹھا رہتا تھا۔
بڑا چاچا ہم سبھوں سے کہا کرتا تھا کہ میرا یہ بوڑھا کتا میرے ساتھ ہی رہے گا۔ اتنے لمبے سفر میں گنگارام میرے
آگے آگے نہ ہوگا تو میں راستے میں ہی کہیں کھو جاؤں گا ـــ اور تم حیران ہو گے ٹائیگر، ہمارے بڑے چاچا
اور گنگارام نے ایک ہی وقت پران تیاگے۔ ہم سبھی محلے والوں کی پوری تسلی تھی کہ چلو بڑے چاچا کا گنگارام
تو بڑے چاچا کے ساتھ ہے ہی۔ دونوں مزے سے دھیرے دھیرے جا پہنچیں گے ـــ ارے ٹائیگر، دیکھو ٹیلی فون
کی گھنٹی بج رہی ہے ـــ نہیں، ٹھہرو، میں آپ ہی دیکھتا ہوں سننے والا آتنا پڑھا لکھا کہاں ہوگا کہ تمہارے
بھونکنے کا ترجمہ کرتا جائے؟ ٹھہرو، گڑبڑ مت کرو ـــ نہیں، پرے ہو جاؤ، میں نے کہا ہے نا، میں آپ ہی بات
کر لیتا ہوں ـــ ہیلو! ہیلو! ـــ گوپال! ـــ تمہارا مالک ہے ٹائیگر ـــ کیا؟ ـــ نہیں گوپال!
ارے، بھونک کیوں رہے ہو؟ ـــ نہیں، گوپال، میں ٹائیگر سے کہہ رہا تھا ـــ ہاں وہی بھونک رہا ہے ـــ
نہیں، ٹائیگر پاگل نہیں ہے گوپال ـــ تم ـــ ؟ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا گوپال ـــ پاگل تم ہو ـــ
نہیں ـــ نہیں گوپال، اُنہیں مت لاؤ! ـــ نہیں! ـــ

ٹائیگر! ـــ ادھر آؤ ٹائیگر ـــ گھبراؤ نہیں ـــ آؤ، اُن کے آنے سے پہلے میں تمہیں کہیں دور
چھوڑ آتا ہوں ـــ نہیں جاؤ گے؟ ـــ کیوں نہیں جاؤ گے؟ ـــ ارے بے وقوف، مالک کی
نیت خراب ہونے لگے تو وہ بھی چور ہوتا ہے۔ تمہیں کیا پڑی ہے کہ چوروں کی حفاظت کرتے پھرو؟
ہاں بھونکو، خوب غصے میں آ کے بھونک لو ـــ مگر ٹھہرو، اس طرح کام نہ چلے گا ـــ آؤ، میں تمہیں
کہیں چھوڑ ہی آتا ہوں ـــ مجھے اتنی گہری شکایت بھری نظر سے مت دیکھو۔ جی چاہتا ہے تو کاٹ
لو ـــ کاٹ لو مگر اس طرح مت دیکھو!

جب میں تمہیں پہلی بار گھر لایا تھا تو تم شاید چند ہی گھنٹے پہلے پیدا ہوئے ہو گے۔ تمہاری ماں تمہیں
ہمارے مقبرے کے پارک میں چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئی تھی، شاید جانے سے پہلے جب وہ تمہارے ننھے منے
بھائیوں کو سمیٹ رہی تھی تو تم شرارت سے کسی جھاڑی میں لڑھک گئے تھے۔ جب میں نے تمہیں دیکھا تو
اتنی بڑی دنیا میں تم ننھی سی جان اکیلے ہی کھیل رہے تھے اور تمہیں کوئی فکر نہ تھی اور اپنے چھوٹے چھوٹے پیروں
پر کھڑے ہو ہو کر بار بار گرنا تمہیں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ تمہارے موہ سے میرے اندر ہی اندر میری دم ہلنے
لگی۔ پھر میں اپنے آپ سے پوچھنے لگا کہ تھوڑی دیر میں جب تمہیں بھوک ستانے لگے گی تو تم کیا کھاؤ گے۔ اتنی
سردی میں کہاں سوؤ گے؟ ـــ مجھے یقین ہونے لگا کہ قدرت نے تمہیں میرے سپرد کرنے کا فیصلہ

تمہیں ہمدردی کا پاس ہے ٹائیگر، مگر میں کیا کروں؟ تمہیں تو معلوم ہے کہ میں بھی اپنے بیٹے کے

دِل کے باہر ہی رہ رہا ہوں۔ دل کے باہر ہوئے یا گھر سے باہر! ـــــ کوئی دل ہی میں ہو تو جہاں بھی ہو دل ہی میں ہوتا ہے۔ پچھلے مہینے جب یہ لوگ تمہیں میری اطلاع کے بغیر کہیں باہر چھوڑ آئے تھے تو مجھے معلوم تھا کہ کسی دن تم میرے ہی دل کے کسی راستے سے اچانک برآمد ہو جاؤ گے ـــــ اور ویسے ہی ہوا ـــــ تم دو روز میں لوٹ آئے اور تمہیں گلے لگا کر میری جان میں جان آئی۔ میں کیا کروں؟ اپنے ہاتھوں سے تمہیں باہر دھکیل کے میں بھی یہاں کیسے رہوں گا، اس ساری دُنیا میں کیسے رہوں گا؟ ـــــ اور تم لوٹ آئے تو تم کس سے ملوگے؟ ـــــ گھبراؤ نہیں ٹائیگر، آؤ ہم دونوں بڈھے اکٹھے ہی نکل جاتے ہیں ـــــ نہیں ٹھہرو، باہر کی طرف کیوں بھاگتے ہو؟ یہیں بیٹھے بیٹھے اپنی راہ پر ہولیں گے ـــــ

میں نے چند گولیاں ایسے ہی موقع کے لیے رکھی ہوئی ہیں ٹائیگر ـــــ ٹھہرو، اس الماری میں ہیں۔ ٹھہرو! ـــــ یہ دیکھو، یہ ہے شیشی، تین تم لے لو اور تین میں ـــــ ٹھہرو، پانی کے ساتھ لیں گے۔ اچھا، اب منہ کھولو! دیکھو بیٹے، جلدی نہیں کرنا، ہم دونوں کو ساتھ ساتھ جانا ہے۔ فکر مت کرو، میں تمہارے آگے آگے تمہیں سارا راستہ دکھاتا چلا جاؤں گا ـــــ شاباش! ـــــ لو اب دوسری بھی اتار جاؤ ـــــ اور اب یہ تیسری! ـــــ تمہیں معلوم نہیں، گوپال تمہیں مروانے کے لیے میونسپل کمیٹی کے آدمیوں کو لا رہا ہے وہ لوگ اب آ رہے ہوں گے مگر ان کے آنے سے پہلے ہی ہم کوچ کر چکے ہوں گے ـــــ ارے ـــــ باقی گولیاں کہاں گئیں؟ ـــــ شیشی خالی ہے! ـــــ ٹائیگر! ـــــ ٹائیگر، ٹھہرو! ـــــ ٹائی ـــــ نہیں، ٹائیگر! مجھے معلوم تھا کہ شیشی خالی ہے ـــــ ہاں کر تو دیا ہے، مجھے معلوم تھا! ـــــ میں تمہارے آگے آگے ہی جانا چاہتا تھا مگر پیچھے تمہیں کس کے ساتھ چھوڑتا؟ میری طرف اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟ ـــــ جاؤ ـــــ جاؤ اب، نہیں تو وہ لوگ آ رہے ہیں ـــــ واؤ! ـــــ واؤں! ـــــ لو، وہ آگئے! میں نے کہا تھا نا، وہ آ رہے ہیں ـــــ واؤں! ـــــ ہاں، وہی ہیں! آؤ، گوپال! واؤں! ـــــ واؤ! ـــــ ہاں، گوپال، اب ایک ہی بوڑھا کتا باقی رہ گیا ہے۔ ان لوگوں سے کہو، مجھے لے جائیں! ـــــ واؤ! ـــــ واؤں! ـــــ

بھوک پریت

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

اپنی داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے مجھے تھوڑا سا رو لینے دو

تھوڑا سا کیوں برادر؟ خوب خوش ہو کے روؤ۔

نہیں بردار، خوب خوش ہو کے روتا چلا گیا تو تمہیں اپنی داستان بھول جائے گی۔

ہاں، داستان بھول گئی تو میرے پاس سنانے کو کیا رہے گا؟

لیکن تمہاری داستان ایسے طربیہ مقام پر آ پہنچی ہے برادر، کہ میرے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے۔

ہاں برادر، خوشی کے موقع پر جو تھوڑا رو لیتا ہے اس کا دکھ میں بھی ہنسنا بنا رہتا ہے۔

نہیں، اتنی عاقبت اندیشی سے کام لوگے تو اپنی عاقبت کو خواہ مخواہ بگاڑ لوگے۔

وہ تو بگڑ ہی چکی ہے برادر۔

پوری داستان سناؤ برادر، داستان کا اختتام تو تم پہلے بھی بتا چکے ہو

ہاں، جب ساری داستان بیت چکے تو اسے سنانا ہی باقی رہ جاتا ہے۔ تو پھر یہ ہوا برادر کہ شہزادی نے میرے گلے میں اپنی باہیں حمائل کر دیں۔ خدام نے حکومت کا تخت اپنی جگہ سے اٹھا کر وہیں ہمارے پیچھے لا رکھا اور اس تخت پر نیم دراز ہو کر ہم محبت کرنے لگے……

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر
مجھے رونا آ رہا ہے کہ میرے ساتھ بھی یہ سب کچھ پیش کیوں نہ آیا۔
روتے ہو برادر نہ داستان کو آگے بڑھنے دیتے ہو۔
تمہاری داستان تو وہاں آ ہی پہنچی ہے جہاں اسے پہنچنا تھا تو بھوکے ہو تو کھجور کھالو .....
بڑے مزے کی کھجور ہے برادر۔
ہاں، یہ لو یہ پانی بھی لو۔
بڑا میٹھا پانی ہے برادر ــــ اب اپنی داستان آگے بڑھاتا ہوں۔
وہ تو یہاں آ ہی پہنچی ہے۔
کہاں؟
اس صحرا میں، جہاں ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔
ہاں برادر، ٹھہرو مجھے بھی ذرا رو لینے دو
تم یہاں اپنی شہزادی کی گود میں سر دھر لو اور میں یہاں تمہاری ہی گود میں سر دھر کر بساط بھر رو لیتا ہوں
ٹھہرو برادر، پہلے مجھے آرام سے اپنا سر کہیں ٹکا لینے دو، پھر تم میری گود میں اپنی جگہ بنالو۔
لیکن یہ کیا برادر، تمہارے تو گود ہی نہیں۔ اپنی ساری داستان یاد کرو برادر ــ یاد کرو، تمہاری گود کہاں رہ گئی؟
اور کہاں رہے گی؟ وہیں حکومت کے تخت پر شہزادی کے سر کے نیچے۔
اور تم اسے بڑے آرام سے وہیں بھول آئے؟
ہاں، بھول تو آیا برادر! شہزادی کے بال اتنے گھنے تھے کہ وہاں سے اٹھتے ہوئے کہیں دکھائی ہی نہ دی۔

یہ تو بہت برا ہوا برادر
ہاں، برا تو ہوا برادر
اب ایک ہی چارہ ہے! شہزادی کو ڈھونڈو، ورنہ تمہارے گود ہی نہ رہی تو جی کر کیا کرو گے؟
بس جی لوں گا برادر۔
پر جیو گے بھی کیسے؟
ہاں، جیوں گا بھی کیسے؟
جینا ہے تو پہلے اپنی گود کو ڈھونڈو۔
کہاں ڈھونڈوں، برادر؟

حکومت کے تخت پر!
حکومت کے طلسمی تخت کی طرف جو بھی بڑھتا ہے برادر، تخت اسے واپس اچھال دیتا ہے۔
تو پھر اُن خدام کو ڈھونڈو، کہ تخت تمہاری پشت پر ڈال جائیں۔
وہ خدام تو شہزادی کے محل میں ہیں۔
اور شہزادی کا محل؟
میرے خیال میں، برادر
اور تمہارا خیال، برادر؟
میرے پاس ہی ہے پر پتہ نہیں کہاں ہے
تمہارے پاس ہی ہے برادر، تو تمہارے پاس ہی ہوگا۔
پتہ ہی نہیں کہاں ہے برادر، تو کیا پتہ، کہاں ہوگا؟
"ٹھہرو برادر"
ٹھہر گیا برادر
اگر تمہارا خیال بھی تم سے کھو گیا ہے تو پھر ہمیں کیا خبر کہ تم نے کیا کھویا ہے؟
ہاں برادر، تمہاری بات لگتی تو ٹھیک ہے۔
تو پھر مزے سے اپنی داستان آگے بڑھاؤ۔
آگے کیسے بڑھاؤں برادر، اسے تو جہاں پہنچنا تھا، پہنچ لی
ہاں، اس صحرا میں
ہاں برادر، اب ایک ہی ممکن ہے کہ پیچھے جا کے پھر یہاں تک آجاؤں۔
ہاں، یہاں سے آگے کی کیا خبر؟
ہاں برادر، جو کچھ ابھی پیش ہی نہیں آیا اس کی کیسے خبر!
ٹھہرو برادر
ٹھہر گیا برادر
مجھے خبر ہے کہ آگے جا کے ہمارے ساتھ کیا پیش آئے گا
کیا پیش آئے گا، برادر؟
ہم اس صحرا سے نکلنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے
تو پھر آؤ برادر، آگے ہی چلیں۔
نہیں برادر، تم پیچھے جاؤ کہ تم پیچھے سے ہی آئے۔

اور تم برادار؟
میں کہیں سے بھی نہیں آیا برادر، اس لیے بلا تامل اپنے آگے کہیں بھی جا پہنچوں گا۔
کیا تمھیں اجنبیوں سے خوف محسوس نہ ہوگا؟
نہیں برادر، میں کسی سے بھی مانوس نہیں ہوں، اس لیے مجھے کوئی بھی اجنبی معلوم نہیں ہوتا۔
تو پھر چلو برادر، ہم ایک دوسرے کی طرف پیٹھ موڑ کر اپنے اپنے سفر پر تیز گام روانہ ہو جائیں۔
ہاں چلو ــــ
ٹھہرو برادر
ٹھہر گیا برادر
تم کہاں سے ہو کے آ رہے ہو؟
شہزادی کے محل سے
تعجب ہے!
نہیں برادر، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ میرا منہ غلطی سے اِدھر گھوم گیا اور تمہارا اُدھر ــــ
لیکن میں بھی شہزادی کے محل سے ہو کر آ رہا ہوں۔
تعجب ہے!
نہیں برادر، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ یہ راستہ بھی شہزادی کے محل کو ہی جاتا ہوگا۔
ہاں، جاتا تو ہوگا برادر، نہیں تو وہاں کیسے جا پہنچتے؟
ہاں، سبھی راستے شہزادی کے محل کو ہی جاتے ہیں۔
ہاں، وہ راستے بھی جن پر ابھی ہمارا جانا نہیں ہوا۔
ہاں، کسی بھی راستے پر نکل پڑو، وہیں جا پہنچو گے۔
ہاں، برادر، کسی بھی راستے سے لوٹ آؤ۔
ہاں، برادر، لیکن لوٹ ضرور آؤ۔
ہاں، ورنہ بچھڑ جاؤ گے
نہیں، ابھی تو لوٹے ہیں، ابھی بچھڑنے کا ذکر مت چھیڑو۔
ہاں، بچھڑنے کا ذکر چھیڑیں گے تو ملیں گے کیسے؟
ہاں برادر، ملن کا ذکر چھیڑو ــ کیا تم میری شہزادی سے مل آئے ہو؟
مل تو آیا ہوں برادر ــ

ٹھہرو برادر
ٹھہر گیا برادر
پہلے مجھے بتاؤ ــــــ
نہیں، پہلے میری سنو برادر ــــــ تمہاری گود میں شہزادی کے بالوں کے نیچے ڈبیا پڑی تھی۔
میں نے چپکے سے اسے اٹھا لیا پر آتے آتے اپنی گود میں بھول آیا۔
بہت تیری کی! ــــــ تو پھر میں تمہاری ہی گود کو اپنی سمجھ کے اٹھا لایا ہوں۔
میری ہی گود میں پڑے ہو برادر، اسی لیے مجھے اتنے اچھے لگ رہے ہو
اور تم مجھے، برادر۔
اور ایک دوسرے کی گود میں پڑے پڑے ہم یہاں جنت میں آ پہنچے ہیں۔
ہاں برادر، نخلستان اپنے ہزار قدموں سے چل کر خود آپ یہاں آ پہنچا ہے۔
اور خدام نے ہمارے پیچھے حکومت کا تخت ڈال دیا ہے
نہیں برادر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھو، ورنہ یہ طلسمی تخت تمہیں واپس اچھال دیگا۔
ہاں، ہم اپنے خیال سے اچھل آئے برادر تو کسی کام کے نہ رہیں گے۔
اچھل بھی گئے تو کیا مضائقہ ہے برادر؟
ہاں، اپنے خیال سے اچھل کر باہر آگئے تو نفع کیا اور نقصان کیا؟
نفع اور نقصان کو چھوڑو برادر، یہ لو یہ کھجور کھاؤ۔
بڑے مزے کی کھجور ہے برادر
ہاں، یہ لو یہ پانی پیو
بڑا میٹھا پانی ہے برادر
ہاں ــــــ اب سو جاؤ۔
بڑی نیند آرہی ہے برادر۔
ٹھہرو برادر۔
ٹھہر گیا برادر
اگر ہم سو گئے تو ہمیں جگائے گا کون؟
جو سلاتا ہے وہی جگا بھی دیتا ہے۔
تو آؤ، سو جائیں۔

ہاں برادر، سو جائیں
کیا تم سو گئے ہو برادر؟
نہیں برادر، شہزادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں
لیکن مجھے تو لگ رہا ہے کہ سو رہے ہو۔
ہاں برادر، شہزادی کے بال اتنے گھنے ہیں کہ نیند میں اترنے کا احساس ہوتا ہے
ہاں برادر اور چہرہ آشنا شفاف، کہ نیند میں ڈوب کر بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سطح کے نیچے نہیں گئے ہیں۔
ہاں، ہم خواب میں بھی اُسے دیکھتے رہتے ہیں۔
ہاں، اور وہ ہمیں۔
ہاں، ہم سو جاتے ہیں تو ہماری قسمت جاگ پڑتی ہے۔
ہاں، ہماری خوابیدگی میں چاند سے تن برسنے لگتا ہے
تو آؤ برادر، چپکے سے سو جائیں۔
ہاں آؤ ـــــ نہیں، اُدھر نہیں برادر، اِدھر آؤ۔
ہاں، اُدھر تو نیند ابھی جاگ رہی ہے
ہاں، جاگ رہی ہے تو چوروں کو اپنے اندر کیونکر گھسنے دے گی؟

ٹھہرو برادر
ٹھہر گیا برادر
بھوک نے پھر میرے کلیجے میں ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا ہے۔
لو برادر کھجور کھاؤ، ورنہ بھوک تمہارا کلیجہ کھائے گی۔
بڑے مزے کی کھجور ہے برادر۔
یہ لو یہ پانی بھی پی لو۔
بڑا

مسکرا میں۔
ہو جاؤ۔ کے باطن

لیکن برادر، اندر داخل ہی نہ ہوئے تو باہر کیسے نکلو گے؟
ہاں ــــ تو شب بخیر برادر! میں چلتا ہوں
ہاں، جاؤ۔
ہاں، چلتا ہوں۔
پھر آ گئے برادر، گئے بھی نہیں کہ پلٹ آئے ہو
خدا کا شکر ادا کرو برادر، کہ پلٹ آیا ہوں، نہیں تو پل ہی میں ہزاروں کوس کی مسافت طے کر کے کون پلٹتا ہے؟
ہاں، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ لوٹ آئے ہو، مگر برادر، گئے کہاں تھے
کہیں نہیں برادر، بس شہزادی کی رفاقت میں حکومت کے تخت پر ہوا میں پرواز کرتا رہا، اور پرواز کر رہا تھا کہ اچانک تمہاری آوازیں سنائی دیں اور تمہیں کوس کوس کر اس طرح تخت سے نیچے قدم رکھا جیسے ابھی زمین پر ہی تھا۔
لیکن تم تھے تو ہوا میں ہی۔
ہاں، اور کہاں؟
تو اچھا ہی ہوا برادر، کہ زمین پر لوٹ آئے۔ خدا نے ہمیں پر عطا نہیں کیے تو اس کی رضا یہی ہے کہ دھرتی پر پڑے رہیں۔
پر دھرتی پر نیند نہیں آتی برادر
ہاں، یا آتی ہے تو یہی خوف لاحق رہتا ہے کہ اب آنکھیں نہیں کھولیں گے۔
ٹھہرو برادر
ٹھہر گیا برادر
بھوک مجھے پھر تنگ کر رہی ہے
تو کیا ہوا برادر، لو یہ کھجور کھالو۔
بڑے مزے کی کھجور ہے برادر
لو پانی بھی پی لو۔
بڑا میٹھا پانی ہے برادر۔
پیٹ بھر گیا ہے تو اپنی شہزادی کی داستان شروع کرو برادر۔
شہزادی کی داستان شروع کر دوں؟
ہاں برادر۔

اگر مجھے اجازت دو برادر، تو حرف بہ حرف سچائی بیان کر دوں ۔
• ہاں برادر، خدا کا فرمان ہے کہ ہمیشہ سچ بولو۔
تو سچی بات یہ ہے برادر کہ اپنی خوشی کے لیے میں نے ہمیشہ جھوٹ بولا ہے
اسی لیے خدا نے تمہیں اس بے کراں صحرا میں دھکیل دیا ہے ۔
ہاں برادر، اور تمہیں بھی
ہاں مجھے بھی، برادر ــــ لو اور کھجور کھاؤ، بھوک سے دیوانے ہوئے جا رہے ہو۔
ریت کی اسی مٹھی کو پرے ہٹاؤ برادر ــــ اور مجھے سو جانے دو۔
ہاں برادر، آنکھ نہ کبھی کھلی تو کون سی کھجور کھائے گی ؟

جادُو

کام ڈھونڈتے ڈھونڈتے بھابو ہمارے گھر بھی چلی آئی تھی۔ میری نگاہوں نے اس کے سارے وجود کو اس طرح ٹٹولا تھا جیسے مرغی خریدتے وقت میری انگلیاں اس کا انگ انگ ٹٹول کر کچھ بتاتی ہیں کہ اس کا گوشت پک کر بے لذت تو نہ ہوگا۔ اسے دیکھ کر اس کے بڑھاپے کا خیال نہ آتا تھا اور نہ ہی اس کے چہرے سے اس کی پہچان کا کوئی تصور بندھتا تھا، مانو وہ اپنا آپ ہونے کی بجائے کوئی بے جان شے ہو، جو بیدا ہی اس لیے ہوئی ہو کہ اسے اپنے کام کا بنا لیا جائے۔ اس کی یہی پہچان کافی ہے کہ ہماری نوکرانی ہے۔ اگر بھابو بھی کسی کی ماں یا بیوی ہوتی تو اپنا بدن ہی بدن اوڑھے تن تنہا ہمارے پاس کیا لینے آتی۔ مزے سے اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنی اور اپنے گھر کے ایک ایک فرد کی پہچان کے اسباب کرتی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے اس سے پوچھا، اور اس نے تھوڑی دیر جواب نہ دیا تو مجھے تشویش ہونے لگی کہ اگر وہ بہری ہے تو کام کاج میں بہت دقت کا سامنا ہوگا، مگر میں نے اپنا سوال دہرایا تو اس کے منہ سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا کوئی نام نہ ہوتا تو وہ جواب دینے کی پریشانی سے بچ کر بہت خوش رہتی۔

"مالوم نہیں، پہلے پہل کوئی نام ہوگا پر اب جدھر بھی کام کرتی ہوں مالک لوگ بھابو کہہ کر آواج دیتے ہیں۔"

میں نے سوچا کہ جتنی تنخواہ بھی کہوں گا اس سے پانچ دس زیادہ طلب کرے گی، سو میں نے پہلے ہی پندرہ سکاٹ کر پوچھا۔

"بولو، منظور ہے؟"

بھابو نے نہ کہنے کے انداز میں کندھوں کی طرف سر جھلاتے ہوئے کہا: "آں، منجور ہے۔"

میری بیوی نے اُسے متنبہ کیا۔ "گھر کا سارا کام کرنا ہوگا۔ صفائی کرنا، کپڑے دھونا، کھانا بنانا۔ سارا کام۔ ٹھیک ہے؟"

"آں۔"

"آں واں نہیں، خوب اچھی طرح سوچ لو۔"

وہ چپ چاپ خالی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھتی رہی جیسے سوچ کر اپنا کام نہ بڑھانا چاہتی ہو۔

"اور کھانے پر تین یا زیادہ سے زیادہ چار روٹیاں ملیں گی۔ بولو۔"

جواب دیتے ہوئے بھابو کی آنکھوں سے شاداں سی تحزمندی ٹپکنے لگی۔

"مجھے بھوک ہی نا ہیں لگتی۔"

میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں وہ تپ دق کی مریض تو نہیں۔ نہیں، دیکھنے میں تو تندرست ہی معلوم ہو رہی ہے۔ "تمہیں بخار تو نہیں آتا؟"

"نا ہیں۔"

میں نے فیصلہ کر لیا کہ پھر بھی احتیاطاً اسپتال سے چیک اپ کرواؤں گا۔

بھابو کو ہمارے پاس آئے اب تین ماہ سے اوپر ہونے کو آرہے ہیں۔ وہ اتنی مستعدی سے سارا کام انجام دیتی ہے کہ اس کی طرف ہمارا خیال ہی نہیں جاتا۔ کوئی کام رکے یا اس میں خرابی پیدا ہو تو وہ ہمارے سر پر سوار رہے۔ ورنہ سب کچھ چین سے ہوتا رہے تو نوکروں کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنا مزہ کیوں کر کرا کیا جائے؟

میری بیوی نے بھابو کے کام سے پوری طرح مطمئن ہو کر اُس تھوڑے بہت کام سے بھی ہاتھ کھینچ لیا جو پہلے وہ آپ ہی بخوشی کر لیا کرتی تھی۔ اب وہ پورا دن ہمارے ننھے منے اکلوتے لڑکے کے ساتھ کھیلنے میں بتا دیتی ہے۔ یا پھر ہم دونوں بڑی فرصت سے جی بھر کے ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں اور ہمیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہمارا ساتھ جنم جنم کا ہے اور ہر جنم میں ہمارا یہی بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک وہ، ایک میں اور ہمارا یہ۔ گھر میں ہمارے سوا اور کوئی نہیں۔ بھابو؟ ہاں، وہ نہ ہو تو ہم ایک دوسرے کو بھول کر سب سے پہلے اسی کے بارے میں سوچتے رہیں، مگر ہے، تو ذہن میں دور دور تک کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ذہن میں چھوڑیے، عین ہماری آنکھوں کے سامنے ہو تو بھی نظر نہیں آتی۔ بھوت کی بھوت سارے گھر میں منڈلاتی رہتی ہے اور ہماری آنکھیں اس کے وجود سے یوں گزر جاتی ہیں جیسے خالی ہوا میں سے، اگر وہ بہ اتفاق نظر آ بھی جائے تو یہی لگے کہ کسی جادوگرنی کی طرح ایک دم ہوا میں سے ہی برآمد ہو گئی ہے۔

میری بیوی کو ایک پڑوسن نے تنبیہہ کر رکھی ہے کہ بھابو پر نگاہ رکھو۔ پوری جادوگرنی ہے۔ پچھلے

گھر سے بھی انھوں نے اسی لیے نکالا تھا کہ ان کا بچہ ہر وقت بیمار رہنے لگا تھا۔ مگر جب سے اُسے نکالا ہے کیا مجال ہے جو اُسے چھینک بھی آئی ہو۔

ہمارا بالا اُسے دیکھ کر بڑا خوش ہوتا ہے۔ ہمیں تو وہ نظر نہیں آتی مگر ہمارے بالا کی نظر میں شاید پھلجھڑی کی طرح جلتی بجھتی رہتی ہے۔ یہ آگئی! ۔ وہ گئی! یہ پھر آگئی! ___ اور وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے تالیاں بجا بجا کر اپنی پُرمسرت آواز میں چلا کر کہتا ہے۔ بھا۔ ب .... و۔ و۔ و میری بیوی بھابو کو جھڑک کر باورچی خانے میں جا کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہونے کی ہدایت کرتی ہے اور وہ بجھ کر جانے کے لیے پلٹ جاتی ہے تو بالا بے اختیار رونے لگتا ہے۔ ایک بار تو رو رو کر اس نے سارا کھایا پیا اُلٹ دیا اور میری بیوی کو واقعی شک ہونے لگا کہ شاید بھابو کے جادو ٹونے کا ہی اثر ہے مگر وہ اپنے شک پر آپ ہی ہنس دی۔ بھابو کا کام بڑا اطمینان بخش تھا۔ میری بیوی کو اس کے جادوگرنی ہونے کا یقین بھی ہوتا تو وہ اسے کام سے الگ کرنے کا نہ سوچتی۔ گھریلو سکھ چین بھی تو جادو ٹونے سے کم نہیں ہوتے، کئی بار تو ان کی وجہ سے مالک اپنے نوکروں کے غلام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان سے چڑنے کی نوبت بھی آجائے تو اپنے آپ کو سمجھا بجھا کر چپ کروا لیتے ہیں کہ ایسی کیا بڑی بات ہوگئی ہے۔ لیکن چڑنے کا کوئی سبب بھی نہ ہو تو مالک اسی بات پر چڑا رہتا ہے۔ شاید اسی لیے بھابو سے سختی برت برت کر ہمیں تسکین سی ہوتی ہے، ہماری ہی نہیں، بھابو کو بھی تسکین ہوتی ہوگی۔ کل شام کا ہی ذکر ہے کہ وہ میرے لیے چائے لے کر آئی تو کپ کو تپائی پر رکھتے ہوئے ہڑبڑا سی گئی اور تھوڑی سی چائے چھلک کر تپائی پر گر گئی۔ میں کتاب پڑھنے میں منہمک تھا اس لیے میرا دھیان اس طرف نہ گیا تھوڑی دیر میں سر اُٹھا کر دیکھا تو وہ ابھی تک وہیں کھڑی میری طرف پُر امید نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟"

"وہ چائے گر گئی ہے۔"

اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ اسے تھوڑا سا جھڑک دوں گا تو وہ خوش ہو جائے گی اور اسے میری کمینگی پر محمول کر لیجیے کہ اُسے صرف اس خوشی سے محروم رکھنے کے لیے میں نے مسکرا کر بڑے ملائم لہجے میں کہا "کوئی بات نہیں۔" مگر چند لمحوں کے بعد مجھے افسوس ہونے لگا کہ ذرا سا جھڑک دینے سے میرا کیا بگڑ جائے گا؟ میں نے کتاب سے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا لیکن اب تک وہ اپنی جگہ پر کھڑی کھڑی غائب ہو چکی تھی۔ میں نے مسکرا کر اپنا سر کتاب پر جھکا لیا مگر ابھی پڑھنا شروع بھی نہ کیا تھا کہ اس کی نحیف سی آواز سن کر چونک پڑا۔ وہ میرے سامنے جوں کی توں کھڑی تھی، بے شکل اور اُڑی اُڑی۔ میں خوف زدہ جھلاہٹ سے گویا کسی بھوت سے مخاطب تھا۔

"جاؤ، بابا، جان کیوں کھا رہی ہو!"

بھابو بھوت ہو یا نہ ہو، بھوت اُسی کے مانند ہوتا ہوگا، اس دن گھر میں اکیلا تھا میرا مطلب ہے

کے زور سے جوں کا توں زندہ تھا۔ سارا دن اور ساری رات وہ اس خوف سے ایک پل نہ سوتا تھا کہ سو گیا تو اس کا جادو زائل ہو جائے گا اور وہ سچ مچ مر جائے گا۔ "کیا تمہیں سونے سے ڈر لگتا ہے بھابو کہ مر جاؤ گی؟" کوئی جواب دینے کے بجائے وہ جھوٹے برتن اٹھانے لگی۔

"جواب دو بھابو!"

"جواب کیا دوں، بابو! ایک بار سو کر اُٹھی تو اپنے آپ کو مُردہ پایا۔" اس کے ہاتھ سے ایک کٹوری گر گئی تو مجھے بھول کر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "باورچی کھانے میں پہنچ کر توری کھرلیتی ہوں۔"

کٹوری کو دبوچ کر وہ باہر جانے کے لیے مڑنے لگی تو میں اس کی طرف حیرت سے تک رہا تھا۔

"ٹھہرو بھابو، کیا تم پاگل ہو؟"

"پاگل بھی ہوں تو کیا؟ کم سے کم جندا تو ہوں!"

"مر گئی تھیں تو زندہ کیسے ہو؟ ٹھہرو، جاؤ نہیں۔ پہلے مجھے اپنا سارا قصہ سناؤ۔"

"بی بی جی کو سنا دوں گی۔"

"نہیں، مجھے بھی سناؤ۔"

"آپ کے سننے کا نا ہیں، بابو۔ بولا ہے نا، بی بی جی کو سنا دوں گی۔" وہ برتن اکٹھے کر کے سراسیمہ سی کمرے سے باہر نکل گئی۔

بعد میں میری بیوی کے پوچھنے پر بھابو نے بتایا کہ جوانی میں سوتے میں نامعلوم کس نے اس کی عزت لوٹ لی جس سے وہ حاملہ ہو گئی۔ ہزار مصیبتیں جھیل جھیل کر اس نے اپنے بچے کی پرورش کی مگر سر نکالتے ہی اس کالڑکا اُسے چھوڑ کر نامعلوم کہاں چلا گیا۔ میری بیوی نے مجھے بتایا کہ اپنا قصہ پورا کر کے وہ کہنے لگی، اچھا ہی ہے حرام کی اولاد مونچھیں پھوٹنے سے پہلے ہی دفعان ہو گیا، ورنہ مونچھوں کو تاؤ دے دے کر میری ترپھ دیکھتا تو مجھے اس کے ان دیکھے باپ کی صورت دکھ جاتی اور لگتا کہ اسی نے میری اجت لوٹی تھی۔

مجھے بھابو پر ترس آنے لگا کہ بے چاری کتنی اکیلی ہے مگر پھر جھٹ ہی کچھ سوچ کر میں نے اپنی بیوی کو وارننگ دی کہ وہ بالا کو اس کے ساتھ اکیلا کبھی نہ چھوڑے۔ پگلی عورت ہے، محبت ہی محبت میں کہیں معصوم کا گلا نہ گھونٹ دے۔

"پاگل تو وہ ضرور ہے،" میری بیوی مجھے بتانے لگی۔ "میں نے کئی بار اُسے کچن میں آپ ہی آپ باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔"

"ارے ہاں۔" مجھے اس دن کا واقعہ یاد آ گیا۔ "سنا تو ایک بار میں نے بھی تھا مگر سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا"

"سمجھ میں آنے والی کوئی بات ہو تو سمجھ میں آئے۔ باؤلی سے اسٹوو نہیں جل رہا تھا اور ہاتھ منہ کالا کر کے وہ اُسے دھمکا رہی تھی: ایک بار جل تو پھر دیکھنا کس طرح بدلہ چکاتی ہوں، اپنے آپ کو دیکھ دیکھ کر بس

جلتے رہو گے۔"

میری بیوی اور میں ہنسنے لگے۔

"ہمارے ساتھ ہوتی ہے تو چپ کی اوٹ سے باہر نہیں آتی۔"

"ہاں" میری بیوی نے کہا، "مگر جب اپنے ساتھ ہوتی ہے تو اسے چپکے سے سنا کرو۔ دیوانی کی زبان رکنے میں نہیں آتی۔ ایک دفعہ کچن کی اندرونی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی کہ اچانک اچھل کر پرے ہو گئی اور چھت سے فرش تک ساری دیوار پر نظر جما کر بولی رب بے گری کیوں پڑتی ہو؟ میں تو پہلے ہی مری ہوئی ہوں ـــــ ہنس رہی ہو؟ خوب ہنس لو مگر یاد رکھو ہنستے ہنستے ٹوٹ گئیں تو ملبے کا ڈھیر ہو کر رہ جاؤ گی۔"

ہم دونوں بھابو پر ہنستے رہے اور ہنستے ہنستے ایک دوسرے کو اتنے اچھے لگنے لگے کہ بجلی کی اندھی گاڑی بھابو کو پٹڑی پر روند کر کہاں کی کہاں نکل گئی اور اس کی خود کار ریکوں نے اسے یکلخت دھکے سے یہاں لا کھڑا کیا جہاں بالا نیند سے بیدار ہو کر رونے لگا تھا۔ ہم بالا کو جھلانے لگے ــ ایک وہ، ایک میں اور ایک ہمارا یہ ـــ مردم شماری والے نے پوچھا تھا، بس تین؟ ـــ ہاں ـــ کوئی نوکر؟ ـــ ہاں، ایک ـــ ہے ـــ تو پھر چار کہیے نا ـــ ہمارے گھر میں ـــ آپ کے گھر میں تین ہی سہی مگر ملک میں تو چار ہیں۔ چوتھے کا نام؟ ـــ بھابو کا کوئی نام نہیں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں، ہمارے ملک میں کم سے کم ایک چوتھائی آبادی بے نام ہے۔ وہ لوگ ہیں ہی نہیں، مگر ہم ان کے فرضی نام رکھ کر خانہ پری کر لیتے ہیں ــ چلیے، آپ کی بھابو کا بھی کوئی فرضی نام لکھے دیتا ہوں ـــ ودیا ـــ آؤ بھابو، یہاں انگوٹھے کا نشان لگاؤ ـــ دیکھیے نا، آپ سدھے ہوئے حروف میں دستخط کریں تو جھوٹ پر بھی سچ کا گمان ہوتا ہے، مگر انسانی انگوٹھے کی فطری لکیروں کا نشان کتنی معصومیت سے اپنی ساری سچائی چھاپ دیتا ہے۔

"جاؤ بھابو، کالک کو صابن سے دھو کر روٹیاں پکاؤ۔"

مگر پہلے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کوئی گھنٹہ بھر پیشتر میں نے کیا دیکھا۔ بھابو آٹا گوندھنے بیٹھی تھی کہ میں نے آنکھوں اور کانوں سے سب کچھ براہ راست دیکھ سن لیا۔

پہلے تو اس نے پرات کو اٹھا کر کہا، اٹھو، سوئی پڑی رہو گی تو آٹا میں اپنے سر میں گوندھوں گی پھر صندوقچے سے دو لوٹے آٹا بھر کر اسے پرات میں ڈال دیا اور اس سے باتیں کرنے لگی ـــ ارے کیوں جا رہے ہو رے؟ ہاں، یہ لو، پانی پیو۔ ناہیں، چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرو ـ اور چھوٹے ـــ

دیوار سے لگ کر اپنی ہنسی کو روکتے ہوئے مجھے کچھ اس طرح اچھو آنے کا احساس ہوا گویا میں نے پانی کے پورے گلاس کو ایک ہی گھونٹ میں حلق میں انڈیل لیا ہو۔

آں، اس تراں ـــ بھابو بدستور گندھتے ہوئے آٹے سے ہمکلام تھی۔ اس تراں پیو گے تو میں تو بے گوندھ گوندھ کر ایک جان کر دوں گی۔ بس، بس! اتنا ہی پیو جتنی پیاس ہو ـ کیا؟ آں، گوندھ تو رہی

ہوں گر تم مورے ہاتھوں سے اچھل اچھل کر باہر کیوں جا رہے ہو؟ ــــ اس لیے، کہ کوئی مجھ سے ملنے آرہا ہے؟ موجھ سے ملنے کون آئے گا رے؟ ــــ مورا چھوکرا! اس حرام جادے نے تو اسی دن اپنی ماں کا گلا گھونٹ دیا۔ جس دن وہ گھر سے بھاگ نکلا ــــ کتنے برس ہو گئے ہیں؟ ــــ ابھی بتاتی ہوں۔ ایک ــ دو ــ تین ــ دھیرے کیوں؟ جورنگا کرنہ گوندھوں گی تو تم میں جان کیسے پڑے گی؟ ــ سات گیارہ ــ بارہ! ــ ہاں، بارہ برس ہو گئے ہیں۔ ان بارہ برسوں کا ایک ایک پل پورا، ایک کوس لمبا تھا۔ ہاں اب ریچ بس گئے ہو۔ اب دھیرے دھیرے گوندھوں گی ــ سو تو ناہیں گئے؟ بارہ برس کے پل پل کا حسا جوڑ کر بتاؤ، میں کتنے کوس چل چکی ہوں ــــ آں، ایک پل بھی کہیں نہیں ٹھہری ــ کون بیٹا اپنی ماں کو ہزاروں کوس کے راستے پر اکیلے چڑھا کر الگ ہو جاتا ہے؟ کہا کرتا تھا، ماں ایک بار بڑا ہو لینے دو پھر دیکھنا ــــ کیا دیکھوں؟ ــــ بجر ہی پھوٹ گیا ہے تو ہوا کیا دیکھوں؟ ایک بار کہیں نجر آجائے تو مورا سارا دیکھا ہو جائے ارے آٹے رے آٹے، میں اپنی رام کہانی سنا رہی ہوں گر تم گندھ گندھ کر اونگھ رہے ہو۔ ٹھیک ہے بھیا، سو کر تھوڑا سا نکھر جاؤ گے تو تورے پیڑے بناؤں گی ــــ میں بھی انجانے میں بھابو کے ہاتھوں گندھ گندھ کر اونگھنے لگا تھا۔ میں نے سر جھٹکنا چاہا کہ اس جادوئی اونگھ سے باہر آجاؤں مگر ویسے ہی دیوار سے جڑ کر کھڑا رہا۔

اُس پتیل کی گاگر نے شاید دور سے چمک چمک کر بھابو کو آواز دی تھی۔ وہ اس کی طرف منہ لٹکا کر کہنے لگی، ہاں بابا، تم جاگ رہی ہو مگر دھاگے کا سرا ہی مورے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے تو کھینچوں کیا؟ ــــ اپنا سرا ــ ہہ ہا ــ ہہ ہا! ــــ وہ کانچ کے گلاسوں کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔ دنیا جہان کی باتیں سناتی رہتی ہوں مگر تم سدا کھالی رہتے ہو۔ بھرے بھرے نجر آجاؤ تو دیکھنے والا پیار سے منہ سے لگائے۔ ناہیں نمک دانی سے پرے ہی رہو ــــ ناہیں تو لال مرچ کی باس سے چھینک کر ٹوٹ جاؤ گے۔ بڑی تیج ہے! ــــ پھر وہ نمک دانی پر سر جھکا کر مرچ سے گویا ہوئی۔ گُسّہ نہ ماننا بڑی بی۔ اتنی تیج ہو کہ سبھی نکتے پھرتے ہیں۔ تو بے ملکے دیکھوں؟ نہ بی نہ، مو جھے چکھ چکھ کر تو بے بڑا اچھا آتا ہے، تو چکھتی رہا کرو بڑی بی میں مناں تھوڑا ہی کرتی ہوں ــــ کیا ــ؟ ــــ اپنے کھوئے ہوئے چھوکرے کی باتیں سناؤں۔ کیا سناؤں؟ ــ کہیں مل جائے تو تم ساری کی ساری اس کے منہ میں اُلٹ دوں۔ بتاؤ اپنی سگی ماں کے ساتھ کوئی اس ترں بھی کرتا ہے! ارے تم سب نے ایک ہی وکھت کیوں بولنا شرو کر دیا ہے؟ ــــ ایک ایک کر کے بولو ــــ ناہیں موجھے کیا پتہ، اب وہ کہاں ہے؟ ہے بھی، جانہیں ــــ اور موبھی، تو اب مورا تو ناہیں، اپنی اُس ماں کا ہے جسے جورو بنا کے اُس کے ساتھ رہتا ہوگا۔ ارے پھر بھابو ــ بھابو! ــ بھابو! ــ میں کیا بہری ہوں؟ چپ! ــــ بھابو نے سبھی اشیاء کی طرف سر گھماتے ہوئے اپنا ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر کہا۔ چپ! ہمارے باورچی خانے کی ایک ایک شے سانس روکے کر بول بول کر بھابو کے سنسار میں شریک

تھی اور میں بدستور باورچی خانے کی باہری دیوار میں گڑا ہوا تھا۔

بھابو ہاتھ دھونے کے لیے اٹھنے لگی تو اشو و نے غالباً سر اٹھا کر اس سے کہا۔ آج میں تمہیں تنگ نہیں کروں گا بھابو! اپنے آپ چل پڑوں گا۔

——— ہاں، جو اپنے آپ چل پڑتے ہیں بیٹے، دھوئیں میں ان کا دم نہیں اٹھتا ———

بھابو پانی کے نل کے پاس آ کھڑی ہوئی ——— بولو، آج بھی پانی سے کھالی ہو؟ تو بے بندی پڑا رہنے دوں ——— ناہیں! آج اتنے بھرے بھرے ہو کے گوتے کھا رہے ہو

بھابو نے نل کھول دیا تو پانی فرطِ مسرت سے بھابو، بھابو کرتا ہوا، اس کے ہاتھ دھونے لگا۔

شور کیوں مچا رہے ہو رے؟ اتنے سا یہ ہو پھر کبھی دیکھنے میں ناہیں آتے۔ سر کچھ سنائی دے رہے ہو۔ ارے بھائی، آتنا اونچا مت بولو۔ دھیرے دھیرے بول کر سمجھاؤ تو کچھ سمجھ میں بھی آئے۔

چھ ——— چھا ——— بھابو! ——— چھا ——— بھابو! ———

ارے ہاں پانی ہی تو بول رہا ہے! ——— چھا! ——— بھابو ——— ابھی تک تو مجھے صرف بھابو کی باتوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ ساری اشیا بول رہی ہیں مگر ——— شاید آپ یقین نہ کریں ——— اب میرے کان بھی انھیں سننے لگے۔ چھا ——— بھابو۔

توری چھل چھل ہیں موجھے کچھ بھی سمجھائی نا ہیں دے رہا ——— بھابو نے نل کو گھما کر پانی کا دباؤ کم کرنا چاہا۔

نہیں بھابو۔ مجھے پورا کھل کر بولنے دو۔

پورا کھل کر بول لو بابا ——— وہ بھی کھل کر بولا کرتا تھا۔ مگر کیا مالوم مجھے ڈبو کر کدھر چلا گیا؟

چھلا کہاں گیا، بھابو؟ پانی کہیں بھی ہو، اپنے اندر ہی اندر تم اسی میں ڈوبی ہوتی ہو ——— میری طرف دھیان سے دیکھو ——— اور دھیان سے دیکھو بھابو!

بھابو پانی کو لتنے دھیان سے دیکھنے لگی کہ وہ اس کی آنکھوں میں بھر آیا۔

میں پتھر کا پتھر دیوار سے جڑا ہوا تھا اور پھوٹ پھوٹ کر دیکھے جا رہا تھا کہ اپنی جان چھڑک چھڑک کر بھابو نے ایک ایک بے جان شئے میں جان ڈال دی ہے ——— مجھ میں بھی!

جاگیردار

وہ بارہ تیرہ سال کی بڑی معصوم شکل بچی کی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی پہلے تو مجھے دیکھ کر اس نے اپنا ہاتھ جھٹ سے پیچھے کر لیا اور پھر جھجکتے ہوئے اسی ہاتھ کو آگے بڑھا کر بولی۔ یہ چٹھی! ــــــ

میں اس کے ہاتھ سے کاغذ کا پرزہ لے کر پڑھنے لگا۔

جناب عالی، میں آپ کے محلے میں ہی رہتا ہوں۔ کبھی بہت اچھے دن دیکھے تھے۔ آج بہت نازک صورت حال سے دوچار ہوں۔ اپنی بیٹی کو بھیج رہا ہوں، ممکن ہو تو کم سے کم پانچ روپے بھیج دیجئے تاکہ گھر میں ہانڈی پک سکے۔ آپ کے پیسے جلد ہی لوٹا دوں گا شریف آدمی ہوں مگر ــــــ

میں نے آخری دو سطریں پڑھے بغیر چٹھی لکھنے والے کا نام دیکھنے کے لیے نظر نیچے سرکائی ــــــ جاگیردار ــــــ اور جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

مجھے یہاں رہائش اختیار کیے پورا ایک ماہ بھی نہ ہوا تھا اور اتنے بڑے محلے کے سبھی لوگوں سے تو کیا اپنے فوری پڑوسیوں سے بھی میں ابھی تک ناواقف تھا ــــــ ہوگا کوئی غریب بے چارہ ــــــ میں دروازہ بند کر کے واپس اندر آ گیا۔

اس واقعے کو کوئی ڈیڑھ دو ماہ ہوئے۔ میں ایک دن سینما کے میٹنی شو کے لیے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

دروازے پر وہی لڑکی کھڑی تھی۔

مجھے خیال آ گیا کہ شاید پیسے لوٹانے آئی ہے۔

یہ چٹھی! ——

اس کے باپ نے اسی عبارت میں پھر پانچ روپے مانگ بھیجے تھے۔ میں نے جلدی سے جیب سے دو روپے نکالے اور لڑکی سے کہا یہی لے جاؤ۔

لڑکی چلی گئی تو مجھے شرمندگی سی ہوئی —— کوئی ایسی مجبوری ہی ہو تو سفید پوش اس طرح ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ مجھے پانچ ہی بھیج دینا چاہیے تھے۔

اس کے بعد وہ لڑکی مجھے تین چار ماہ تک نظر نہ آئی اور پھر ایک دن دروازے پر ویسی ہی کھٹکھٹاہٹ ہوئی۔

وہی لڑکی کھڑی تھی۔

یہ چٹھی!

جاگیردار نے عین اسی عبارت میں اب کے دس روپوں کا مطالبہ کیا تھا۔ میں نے مسکرا کر لڑکی کے ہاتھ میں اس دفعہ بھی دو کا نوٹ تھما دیا اور یونہی سوچنے لگا کہ بھلا آدمی اسی طرح مانگ تانگ کر وقت کاٹنے کا عادی معلوم ہوتا ہے —— چلو۔ میں نے دو ہی تو دیے ہیں۔ سر جھٹک کر میں اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

گزشتہ سات آٹھ ماہ کے بیشتر ایام میں نے کاروبار کے سلسلہ میں گھر کے باہر بتائے۔ اس دوران وہ لڑکی کبھی آئی ہو تو مجھے معلوم نہیں۔ آج صبح کے وقت میں دودھ والے کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر گھنٹی کی آواز سن کر میں برتن لے کر باہر گیا کہ دودھ ڈلواؤں۔ دروازے پر دودھ والے کی بجائے ایک ادھیڑ عمر شریف پوش شخص کھڑا تھا۔

میرا نام جاگیردار ہے

آیئے۔

نہیں مختصر سی بات کرنا ہے یہیں کیے دیتا ہوں۔

کہیے۔

اس بار لڑکی کو چٹھی دے کر نہیں بھیجا، آپ ہی حاضر ہو گیا ہوں —— مجھے آپ سے یہ درخواست کرنا ہے کہ ——

میں نے اسے روپیہ دو روپے دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

نہیں، ٹھہریے، پہلے میری گزارش سن لیجیے —— میں اپنی چٹھیوں میں جو رقم لکھوں، مہربانی کر کے آپ وہی بھجا کریں تو —— میں اس کی طرف حیرت اور غصے سے دیکھنے لگا۔

میری بیٹی اب پوری جوان ہو چکی ہے جناب، اب تو آپ کو پورے ہی پیسے چکانے ہوں گے!

••

رسائی

میرا آفس دُنیا کے اس سب سے بارونق شہر میں ایک چالیس منزلہ جدید عمارت "فائر آرم" کی چالیسویں منزل پر واقع ہے۔ فائر آرم کو نئے انسان نے اپنی تمامتر سائنسی تدبیر کو کام میں لاکر تعمیر کیا ہے اور اس کی ٹاپ پر میری شاپ ہے جہاں وہ مجھ سے اپنی قسمت دریافت کرنے آتا ہے۔

میرا پیشہ جیوتش ہے اور پسند فلسفہ۔

جیوتش میرے لیے کوئی 'ہتھکنڈہ' نہیں، ایک باقاعدہ روحانی سائنس ہے (سائنس جھوٹ نہیں بولتی اور روحانیت جھوٹ کی سچائی کو بھی تسلیم کرتی ہے) میں بڑی احتیاط سے اندھیرے میں رک رک کر بڑھتا چلا جاتا ہوں اور ان اجنبی تاریکیوں میں مجھے کہیں کہیں روشنی کے نقطے نظر آنے لگتے ہیں اور ان نقطوں کی دھندلی سی ٹمٹماہٹ میں انجانے کی جانی پہچانی علامتوں کا احساس ہوتا ہے اور ان علامتوں کو اپنے ذہن میں منقش کرکے ـــــ میرے ذہن میں کائنات کی اَن گنت علامتیں جمع ہو چکی ہیں اور ان سب علامتوں کی کیٹالاگنگ میں نے اتنی خوبی سے کر رکھی ہے کہ بیشتر مسائل کے حل مجھے بغیر کسی دقت کے یہیں مل جاتے ہیں۔ میں اپنے جسم میں لوٹ آتا ہوں۔ یہاں اپنے انٹرویو روم کے عقب میں اس آرام کرسی پر اور میرے جسم میں حرکت ہونے لگتی ہے۔ اپنی روز افزوں شہرت سے اب مجھے اکثر یہ خوف رہتا ہے کہ اگر میری غیر موجودگی میں کوئی میرے جسم کو لے اڑا تو ـــــ تو میں اور میرا ذہن کہاں رہیں گے (میرا ذہن سدا میرے ساتھ ساتھ رہتا ہے ـــــ ساتھ ساتھ ؟ کہاں ؟ میں اب تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ جسے میں اپنا آپ کہتا ہوں، وہ کیا ہے، میرا ذہن یا میں ؟ ـــــ یا میرا ذہن ہی میرا اپنا آپ ہے؟) ـــــ ؟ اپنے جسم کے بغیر میں کہاں رہوں گا ؟ "فائر آرم" کی چالیسویں منزل میں ؟ میرے اس مسکن کے بارے میں پہلے ہی مشہور ہے کہ یہاں بھوت پریت بستے ہیں (بھوت پریت بیچارے کہیں وہ مظلوم لوگ

تو نہیں جن کے جسم اُن سے چرائے جا چکے ہوں)۔
ایک بار میں اپنی کسی پیشہ وارانہ کھوج کے بعد جسم کی جانب لوٹ رہا تھا کہ فائرآدم کی چالیسویں منزل پر پہونچ کر بے خیالی میں انٹرویو روم میں یوں ہی اپنی چیئر پر آبیٹھا اور روزمرّہ کا کام شروع کر دیا حالانکہ میرا جسم عقب کے کمرے میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ میری پہلی ملاقاتی ایک حواس باختہ شادی شدہ خاتون تھی، مسز بارکر، جو اپنے شوہر کی مبہم بدسلوکی کی وجہ سے اپنے مستقبل سے ڈرنے لگی تھی۔ میں نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے بڑے تپاک سے مسکرا کر اس کو خوش آمدید کہا اور مجھے خیال نہ آیا کہ میں یہاں بے جسم ہی بیٹھا ہوا ہوں نامعلوم میں اس خاتون کو نظر کیسے آ رہا تھا۔ وہ میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے لگی۔
"آپ اندر جا کر بیٹھیے" میں نے عقب کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا مگر اسے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر میں اچانک اچھل پڑا اور اس سے پہلے کہ کچھ کر پاؤں مسز بارکر تیز تیز الٹے پاؤں باہر آ گئی۔
"کم اِن، مسز بارکر!"
عقب کے کمرے سے میری آواز نے اُس کا باہر لفٹ تک تعاقب کیا۔
میرا خیال ہے اکثر ایسا ہوتا ہوگا کہ ہماری ملاقاتیں انسانوں کی بجائے دراصل اُن کے بھوتوں سے ہوئی ہوں اور اپنی لاعلمی میں اُن سے مل کر ہم بہت خوش ہوئے ہوں، مگر پھر ان ہی لوگوں سے ان کی صحیح و سالم حالت میں مل کر ہمیں ان پر بھوت ہونے کا گمان گزرا ہو اور خوفزدہ ہو کر ہم جسم کے اندر ہی اندر گھس کر جسم کے باہر نکل آئے ہوں۔
کئی بار مجھے اپنے بھوت ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ میں اپنے وجود کے اندر آرام کر رہا ہوتا ہوں جیسے کسی قبر کے اوپر اُگے ہوئے بول کی جڑ میں الٹی لٹکی ہوئی کوئی خوابیدہ روح، کبھی اوروں کے وجود میں، اور کبھی نہ اپنے اندر نہ اوروں کے، نامعلوم کہاں ہوتا ہوں، یا شاید کہیں بھی نہیں ہوتا۔ کہیں نہ ہو کر بھی ہونا، شاید اسی کا نام موت ہے۔ میرے مسلسل ریاض نے مجھے جیتے جی ہی مرنے کا اہل بنا دیا ہے۔ میں ایک ہی زندگی میں بیک وقت جی بھی رہا ہوں اور مر بھی رہا ہوں ——— کیا یہی ابدیت ہے؟ میری ذات میری نوع کے مانند غیر فانی ہو چکی ہے؟ مجھے اپنی ابدیت کا علم ہے یا میرا علم لاعلم ہے؟ ——— مجھے معلوم نہیں کہ میں کیا کیا جانتا ہوں۔ میں لاعلم ہوں۔ کسی کامیاب دنیادار کی طرح جاہل ہوں اور اپنی اس جہالت کی بدولت فانی ہوں۔ آدمی یا ہی مَش کے ناش کا کارن ہوتی ہے ورنہ وہ بھگوان ہوتا۔ توم الیوگیان نیوویگیان نیوویتی ———
میں بھگوان نہیں ہوں کہ مجھے وہ سب کچھ معلوم ہو جو ہے، مگر میں انسان کا مستقبل تا حد نظر بہ آسانی دیکھ سکتا ہوں۔ آدمی کا مستقبل اُس کے اپنے اندر سے ہی باہر پھوٹتا ہے جیسے بیج سے پھول اور کانٹے۔

مَیں چپکے سے لوگوں کے باطن میں جا پہنچتا ہوں اور وہاں اُن کے ماضی سے مستقبل تک سبھی واقعات ایک بڑے فطری سلسلے میں ایک دوسرے سے جُڑے ہوتے ہیں جیسے اجنتا کی گپھاؤں میں تصویروں کا واقعاتی تسلسل. لوگوں کے سر مجھے پہاڑوں کے مانند نظر آتے ہیں اور اُن کے ذہنوں میں پہونچ کر مجھے لگتا ہے کہ میں سجے ہوئے غاروں میں نکل آیا ہوں جہاں پوری کی پوری کائنات بسی ہوئی ہے۔ اس کائنات کی خاموشی میں یہ گمان ہوتا ہے کہ آپ ذرا دور سے کسی بچے کو ہنستا ہوا دیکھ رہے ہیں لیکن اُس کی ہنسی کی آواز کو سن نہیں رہے۔ اس خاموشی میں زندگی کی سبھی آوازیں جذب ہیں، ان کے سنائی دینے کا احساس ہوتا ہے مگر ہم انھیں سُن نہیں رہے ہوتے۔ اسی کیفیت کا نام شاید جنت ہے جس کا بوجھ آدمی ہردم اس لئے سر میں اٹھائے رکھتا ہے کہ کہ آئندہ کبھی ہاتھ پیروں سے نکل کر ذرا چین کے لئے یہاں چلا آئے۔

مس جیوا گاندھی یہاں کی مشہور ڈانسر ہے اور میری پرانی مریض ہے (میں اپنے مؤکلوں کو مریض ہی سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ دراصل اپنے مستقبل کی ڈاکٹرنگ کے لیے ہی میرے پاس آتے ہیں)۔ آج سے کئی برس پہلے وہ مشرق سے رقص کرتی ہوئی اور اپنے مستقبل کا پہاڑ اٹھائے شعلہ بازاں تی ہوئی یہاں مغربی اُفق میں پہونچ کر تھم گئی کہ یہاں سے آگے کوئی راستہ نہ تھا۔ اور پھر اُس کی توانائی ہاتھ پیروں سے نکل نکل کر شفق کے رنگوں میں بکھرنے لگی اور وہ ساری کی ساری سر کے بل اپنے ذہن کی جنت میں گھس آئی اور اس خوب صورت بستی کو غور سے دیکھتے ہوئے اُسے یہ معلوم کر کے بڑا تعجب ہوا کہ یہ جنت تو اس کے خوب صورت ماضی کے عقاب کے مناظر پیش کر رہی ہے۔

جیوا اب اپنے ذہن کی جنت میں ڈن لپ بیڈ کے سرہانے ٹھوڑی جما کر اوندھی پڑی رہتی ہے اور ماضی کے پائل کی جھنکار سن کر ہی اُسے اپنے حالیہ عمل و حرکت کا پتہ چلتا ہے۔ یہی اس کا مستقبل ہے۔ حال کے رقبے کے اندر ہی اندر اُس کا ماضی بظاہر آگے ہی آگے ناچتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ عجیب فریب نظر ہے، آگے ہی آگے ناچتا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر اس مقام سے آگے نہیں بڑھتا۔ مس جیوا کا رقص یہیں تک محدود ہے۔ ناچ ناچ کر جہاں تک اُسے پہنچنا تھا، وہاں تک پہنچ چکی ہے۔ اب وہ اپنے ذہن کی جنت میں اوندھی لیٹی اپنی گذشتہ توانائیوں کا یہی مسلسل رقص دیکھتی رہے گی، اسی ایک آربٹ پر حرکت پذیر رہے گی۔

جیوا ہمارے کرۂ ارض کا دوسرا نام تو نہیں؟

جیوا کو بھی اپنا مستقبل جاننے اور سنوارنے کا خبط ہے لیکن جس طرح دھرتی آج عین اُسی جگہ ہے جہاں وہ پچھلے برس اس وقت تھی، اسی طرح آئندہ برس بھی اس وقت یہیں آ پہونچے گی۔ جیوا کا ماضی ہی اُس کا پیچھا کرتے کرتے اُس کے آگے نکل جاتا ہے اور وہ اسے اپنا مستقبل سمجھ لیتی ہے۔

دراصل مَیں جیوا کے متعلق اس لئے سوچ رہا ہوں کہ وہ ابھی پانچ دس منٹ میں یہاں آ رہی ہے۔

میرے مؤکلوں میں کوئی اسّی فی صد عورتیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عورت اپنی پیدائش پر ہی قسمت

سے بیاہ رچالیتی ہے اور بڑی ہو کر جب وہ کسی مرد سے دوسرا تیسرا یا دسواں بیاہ رچانے کی تدبیر کرتی ہے تو قسمت اُسے باقاعدہ طلاق دینے کی بجائے ہر دفعہ ٹال جاتی ہے اور عورت کو اپنی ہر نئی تدبیر پر یہی گمان گزرتا ہے کہ چوری چوری گناہ کی ترکیب ہو رہی ہے۔ نئی باتدبیر عورت شاید اس لیے اپنے بدن پر طرح طرح کی خوشبوئیں بسائے رکھتی ہے کہ اُسے اپنے وجود سے اپنے بستر کے پہلے ساتھی کی بُو کا احساس نہ ہو مگر اس کا یہ لاابالی ساتھی کبھی اچانک برسوں کی غیر حاضری کے بعد وارد ہو جاتا ہے اور موٹھوں کو تاؤ دے دے کر اُس کی طرف بڑھتا ہے تو اپنے بدن کی اس اور مجمل خوشبو کو اپنی جانب یوں لپکتے پا کر خوشی سے باؤلی ہو ہو کر وہ اس کے آٹھ دس بچے بیک وقت اپنے پیٹ میں جمع کر لینا چاہتی ہے۔ میں اپنے اس بیان کا کوئی سائنسی ثبوت فراہم نہیں کر سکتا، تاہم میرا یہ بیان اس حد تک سائنسی ہے کہ اس کا انحصار میرے گہرے مشاہدے پر ہے۔

عورت کا خوف اور خوشی، اُس کی سالم زندگی اُس کے چہرے پر رقم ہوتی ہے جیسے مرد کی، اس کے ہاتھوں پر۔ اس لئے عورتوں کے چہرے اور مردوں کے ہاتھ دیکھ کر میں انھیں قسمت کا حال بتاتا ہوں۔ لیکن اگر کسی مرد کا ہاتھ کٹا ہوا ہو تو میں اس کے چہرے پر نظر جما لیتا ہوں اور کوئی عورت مجھے اپنے چہرے میں نظر آئے تو اس کا ہاتھ دیکھنے لگتا ہوں۔

مگر جیوا میرے لیے پرابلم بنی ہوئی ہے۔ وہ اپنے چہرے سے خارج ہو کر ذہن میں گھسی رہتی ہے اور اس کا چہرہ ایسا لگتا ہے جیسے ہر اُس عورت کا، جس کی طرف آپ کا دھیان چلا گیا ہو۔ اسی لئے جب اُس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو اس کا خیال آنے کے بجائے میرا دھیان بے اختیار اُما کی طرف چلا گیا جس سے میں نے اپنا پہلا عشق کیا تھا، مانو جیوا ایک بڑا پیارا فریم ہو جس میں ہر شخص کے محبوب کی تصویر عین فٹ بیٹھتی ہو۔ جیوا کے چاہنے والوں کی کثیر تعداد ہے مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو جیوا پر کسی اور عورت کا دھوکا ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ جو عورت جیوا کے چہرے سے خارج ہو کر اُس کے وجود کے دروں خانے میں ادھل ہے، وہی عورت ہر شخص کی محبوب ہے، وہی میری اور آپ کی اُما ہے۔ ہر عورت کے ذہن میں وہی ایک اُما ہوتی ہے۔

جس عورت کے ساتھ ہم اُس کے ذہن میں سوتے ہیں، وہی ہماری محبوب ہوتی ہے اور جس کے ساتھ اپنے بستر پر، وہ بیوی یا طوائف۔ جیوا نے اپنے مائینڈ میں بھی بستر بچھا رکھا ہے اور کمرے میں بھی، اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ انتظار کرتی رہتی ہے اور اُسے معلوم ہے کہ اصل میں وہ ان لوگوں کی محبوب ہے نہ بیوی، وہ کسی وفا شعار طوائف کی طرح جسے جو کچھ چاہیے فراہم کر دیتی ہے اور اپنے دونوں خالی بستروں پر پہلو بدل بدل کر بے حال ہو ہو جاتی ہے۔

ناچ ناچ کر جیوا کا جی نہیں بھرتا اور اس کے چاہنے والے اس کا ناچ دیکھ دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں اور کچھ دیر بعد اپنی مبہوت ستائش سے تھک کر چور ہو جاتے ہیں اور اُسے چھوڑ کر اپنی راہ ہو لیتے ہیں۔

مگر جیوا بدستور ناچتی رہتی ہے۔

جیوا واقعی ہمارا کرۂ ارض ہے، ہماری کائنات ہے اور ہم اپنے اپنے کام سے نہیں تھکتے بلکہ اپنی کائنات کی گردش کے تواتر کو اپنے بے عمل استعجاب سے دیکھ دیکھ کر ہم میں ہلنے کی سکت نہیں رہتی۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بجائے ہماری کائنات ساکن پڑی ہے اور ہم لگاتار گردش کر کر کے بے دم ہو رہے ہیں۔

"میرے چاہنے والے مجھے چھوڑ جاتے ہیں رام،" چند روز کی ملاقات کے بعد جیوا مجھے میرے پہلے نام سے بلانے لگی تھی، "کوئی نہیں جو میری حرکت کے کرب کی تاب نہ لاکر مجھے روک لے۔ سب میری بے قراری سے ذرا محظوظ ہوتے ہیں اور پھر چل دیتے ہیں۔ کیا دنیا آدمی کا ساتھ نہیں دیتی یا آدمی ہی دنیا کو چھوڑ جاتا ہے؟ کوئی نہیں رام، جو میرے پر ہیجان وجود کو کھڑا کرے اور میری کھڑی کھڑی شبیہ کو دل میں اتار لے۔ کاش میں اپنا آپ ہونے کے بجائے اپنی تصویر ہوتی ——!"

ہاں، متحرک چہرے بے نقش معلوم ہوتے ہیں اور ہم انہیں بھول جاتے ہیں مگر ہماری طرف منہ کیے کھڑی کھڑی تصویریں ہمارے دل و دماغ میں محفوظ رہتی ہیں۔ اپنے باپ کا وہی چہرہ میرے ذہن میں آباد ہے جو میں اپنی بیوہ ماں کے بیڈ روم میں اس کی سیدھی اور پوری تصویر میں دیکھا کرتا تھا۔

"سکوں کی خواہش مجھے ہر دم بے تاب رکھتی ہے رام، میرے اندر میری قبر بنی ہوئی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ جلدی جلدی مر کر اس قبر میں سما کر چپٹی ہو جاؤں اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو —— تم جیوتشی ہو —— مجھے بتاؤ، کیا میری قسمت میں کوئی ایسا عاشق لکھا ہے جو مجھے کھڑا کر دے۔ یقین کرو میں صرف اس لیے گھومتی پھرتی ہوں کہ کوئی مجھے روک لے ——"

اور جیوا کا یہی سوال میں آپ سب کو مخاطب کر کے دہراتا ہوں۔

"ہے کوئی جواں مرد، جو گردش کرتی ہوئی دھرتی کو اپنے بازوؤں میں کس کر ٹھہرائے —— ؟ —— ہے کوئی —— ؟"

مگر میں ناحق آپ سے یہ سوال کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو ہیرو بننے کی خواہش ہے نہ فرصت آپ تو چوبیس گھنٹے اپنے انحطاط کا سامان پیدا کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ کام کرنا پڑ ہی گیا تو آپ مزے سے کوئی ڈرگ استعمال کر لیں گے تاکہ بے چین ہو ہو کر گھومتی ہوئی کائنات آپ کو ٹھہری ٹھہری نظر آئے۔ آپ اپنے ہر کام کو پورا کئے بغیر ہی پورا کر لیتے ہیں۔

(جیوا ابھی تک کیوں نہیں آئی؟)

ہمارے دور کا سارا کاروبار ڈرگز سے ہی چل رہا ہے۔ ہمارے فنانس منسٹر اچھی خاصی ڈرگ لینے کے بعد ہی اپنی اپنی قوم کا سالانہ بجٹ پیش کرتے ہیں اور حزب مخالف کے ان گنت نکیلے اعتراضات کا نہایت چین سے مسکرا مسکرا کر جواب دیتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے اجلاس میں ڈرگ کے اثرات کے تحت ہی دشمن قوموں کے نمائندے

بڑی نفرت سے ایک دوسرے سے نہایت محبت سے پیش آتے ہیں۔ اور تو اور، میری مرحوم سکریٹری کو ــــ مرحوم ڈرگ کے اوور ڈوز ہی سے ہی جان بحق ہوئی ــــ اپنے شوہر سے لڑنا یا محبت کرنا درکار ہوتا تو وہ چپکے سے اپنی خوراک کی دگنی مقدار حلق میں انڈیل کر با سانی اپنا ڈرامہ شروع کر دیتی۔

آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں؟ دراصل میں چوری چوری ان لائسنس ایبل ڈرگز کا بھی دھندا کرتا ہوں، اب آپ سے کیا پردہ؟ دراصل یہی دھندا کرنے کے لئے میں نے جیوتش کا پیشہ (پاکھنڈ نہیں میں واقعی بڑا ماہر جیوتشی ہوں) اختیار کر رکھا ہے۔ میرے پاس بے حساب کوکین، افیون، گانجا اور بھانت بھانت کی نشیلی جڑی بوٹیاں مشرقی ممالک سے پہنچتی ہیں اور میرے بیشتر ایجنٹ میرے جیوتش کے پرستار بن کے آتے ہیں اور میرا مال فوراً کلیئر ہو جاتا ہے۔ مغرب کے ہلکے پھلکے نشے ہم اہل مشرق کو بھلے لگتے ہیں لیکن اہل مغرب ہمارے مردانہ نشوں پر جان دیتے ہیں۔

شروع شروع میں مجھے تعجب ہوتا تھا کہ میرا نشے کا یہ ڈھیر سارا سامان کیوں کر کھپ جاتا ہے۔ آخر ایک ویک اینڈ کی شام کو میرا ایک متمول ویسٹ انڈین ایجنٹ ماتھو مجھے اپنے ایک اڈے پر لے گیا۔ روانگی کے وقت کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے جھجک جھجک کر تجویز کیا کہ میں اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لوں، مانو میں کسی جدید یورپی یونیورسٹی کا ریسرچ اسکالر ہوں جو کھلی کتابوں سے ہی اپنی فکری ساخت کا جغرافیہ دریافت کر سکتا ہے۔ بے وقوف! آنکھوں پر پٹی بندھتے ہی میری بالائی پیشانی شق ہو گئی اور میری جلد کے نیچے ذہن کی تیسری آنکھ ابھر آئی اور مجھے اپنا آس پاس بخوبی نظر آنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر ماتھو نے میری من پسند سگریٹ کا پیکٹ ــــ ان سگریٹوں کا کاغذ پوست میں بھگو کر سکھایا گیا تھا ــــ جیب سے نکالا تو میں اپنی اشتہا کو روک نہ سکا۔

"لاؤ میں بھی پیوں۔"

"تم ــــ کیا تم ــــ !؟" ماتھو میرے جادو سے پہلے ہی مرعوب تھا۔

"ہاں، تم میری آنکھوں پر دس اور پٹیاں باندھ کر مجھ سے پوچھو کہ تمہارے جسم میں کون کون سی رگ اس وقت کیسے اور کہاں ہل رہی ہے!"

"او مائی گاڈ! شیطان کے قائل ہو کر ہم بے اختیار خدا کا نام لیتے ہیں۔

اس نے میری پٹی کھول دی اور میری پیشانی کی جلد کے نچلے پٹ از خود بند ہو گئے اور میں نے مسکراتے ہوئے پوست کا سگریٹ سلگا لیا اور کش لیتے ہوئے مسکرانا بھول گیا اور مجھے سارے عالم کا چہرہ جیوا کے چہرے کے مانند بے نقش معلوم ہونے لگا۔

جب ہم شہر سے باہر پہونچے تو اندھیرا بہت گہرا ہو رہا تھا اور ہمیں سڑک صرف اتنی دور تک نظر آ رہی تھی جہاں تک ہماری موٹر کار کی لائیٹ پہونچ سکتی تھی۔ ہمیں صرف اتنے ہی فاصلے تک نظر آتا ہے جہاں تک ہمیں روشنی کی فوری ضرورت ہو اور یہ مختصر سی روشنی ہمارے ساتھ ساتھ دوڑتی رہتی ہے اور جو کچھ ہم دیکھ لیتے ہیں وہ بھی، اور جو کچھ نہیں دیکھ پاتے وہ بھی فوراً پھر تاریکی میں ڈوب کر بے شکل ہو جاتا ہے۔ کیا زندگی

اسی فوری ضرورت کا نام ہے ؛ میری فوری ضرورت یہ ہے کہ میں اپنی گردش کرتی ہوئی کائنات کو کھڑا کر کے بیک وقت دیکھ لوں ـــــ ہے کوئی جوان مرد ـــــ ؟ ہاں، ہے ـــ ! دیکھو میں نے گلوب کو اپنے بازوؤں میں کس کر ٹھہرا لیا ہے (پوست کا سگریٹ کتنا پیارا اور نشہ آور ہے !)

جیوا ! ادھر میری طرف دیکھو جیوا ! اگر تم اپنے چہرے میں نظر نہیں آتیں تو کیا مضائقہ ہے ؟ میں تمہاری ہتھیلی میں ہیتیں دیکھ لوں گا۔ اے میری محبوب، تم مرد ہو، تمہارا چہرہ مٹھی میں ہے اپنی مٹھی کھولو کہ میں تمہاری ہتھیلی کی لکیریں دیکھ کر تمہیں پہچان لوں (جیوا کی ہتھیلی بھی اُس کے چہرے کے مانند لکیروں سے عاری ہے) ـــــ جیوا، تم عورت ہو کر بھی مرد ہو لیکن چونکہ تم عورت ہو، اس لئے مرد نہیں ـــــ اے میری کائنات، تم عورت ہو نہ مرد، تم صرف اپنا آپ ہو۔ اپنے تسلسل کا باعث خود آپ ہو بے تقدیر ہو یعنی تمہاری تقدیر اچھی ہے نہ بری، بس ہے ہی نہیں۔ تمہارے مستقبل کی پیشین گوئی عبث ہے لیکن تم چاہو تو میں تمہارے ماضی کا حال بتا سکتا ہوں۔ تمہارے ماضی کی پیشین گوئی، کر سکتا ہوں۔ بولو ! بولو جیوا !

(جیوا ابھی تک کیوں نہیں آئی ؟ !)

کئی کچے راستوں اور جنگل نما دشوار گذار ٹکڑوں سے گزر کر ہماری گاڑی اب چند کھنڈرات کے عین اندر جا رہی تھی۔

" آگئے ہیں " ماتھو نے ایک بڑی پرانی، تنہا عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

" ہمارے کئی ایسے بے نام اڈے ہیں اور پولیس کو ڈاج کرنے کے لئے ہم احتیاطاً اپنی جگہیں بدلتے رہتے ہیں۔"

عمارت کے اندر اور باہر کونوں میں چور زینوں سے اتر اتر کر ہم پھر آسمان کے نیچے آگئے جہاں ایک بڑا لمبا چوڑا لان مصنوعی چاندنی میں ننگا نہا رہا تھا اور یہاں وہاں بچھی ہوئی کرسیوں پر یا نیچے لان ہی پر بہت سے لوگ بیٹھے کھڑے یا لیٹے ہوئے تھے۔

ماتھو نے مجھے چند لوگوں میں لا بٹھایا۔

" آپ ہمارے مشہور جیوتشی رام پرشاد ہیں "

ایک ادھیڑ عمر شخص نے جس نے اپنی ڈاڑھی مونچھ کو بے ترتیبی سے بڑھا رکھا تھا بھنگ کا گلاس خالی کر کے ایک طرف رکھ دیا۔

" ٹھیک ہے، آیئے " اس نے میرے لیے بھی بھنگ کا آرڈر دے دیا " مجھے آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے ـــــ اگر آپ جیوتشی نہ ہوتے تو میری طرح پروفیسر ہوتے یا پروفیسر نہ ہوتے تو ہمارے رچی کی طرح " اس نے اپنی بائیں طرف بیٹھے ہوئے ایک شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ جو گانجے کی چلم سے کش لیتے ہوئے خلا میں تیر رہا تھا " سائنس داں ہوتے، یا کچھ اور ہوتے ـــــ ہماری پہچان ہمارا پیشہ نہیں، ہم خود آپ ہیں ـــــ معاف کیجئے میں اپنا سوال بھول گیا ہوں "

"بھنگ کا ایک گلاس اور پی لیجیے پروفیسر، سب بھولا ہوا یاد آجائے گا۔"
"آپ ٹھیک کہتے ہیں نشے میں مجھے پیدائش تک کی سب باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔"
"اور پیدائش سے پہلے کی ؟ "
"ہاں، پیدائش سے پہلے کی بھی۔ مثلاً اگر اس وقت میں نشے میں ہوں تو مجھے معلوم ہے کہ اپنی پیدائش سے پہلے میں بھنگ کا جھاڑ تھا۔ میرا اپنا بیج ہی میرے نشے کا باعث ہے۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں ۔۔۔ میرا اپنا بیج ہی ۔، میں کیا کہہ رہا تھا ملینیر؟"
مجھ سے کوئی دو ہاتھ کے فاصلے پر ایک لڑکا کسی لڑکی کو سامنے بٹھا کر اس کی طرف آنکھ جھپکائے بغیر دیکھے چلا جا رہا تھا، یا شاید لڑکی اسے اپنے سامنے بٹھا کر اس کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے ہوئے تھی۔
ماتھو نے مجھے بتایا کہ وہ دونوں افیون کی ایک ایک گولی منہ میں رکھے ہوئے ہیں اور میڈی ٹیشن کر رہے ہیں۔
ان کے ریاض کا معجزہ تھا کہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون کس کی طرف دیکھ رہا ہے۔
میں نے دوسری بار ان کی جانب نظر اٹھائی تو مجھے یہ عجیب سا احساس ہوا کہ لڑکی کے اندر لڑکا ہے اور لڑکے کے اندر لڑکی، اور اگر اس وقت انہیں اپنے اپنے گھر جانے کا خیال آئے تو وہاں جانے کے لیے وہ ایک دوسرے کے گھر چلے جائیں۔
"گیٹ آؤٹ!" لڑکی کا معزز باپ لڑکے سے کہے گا۔ "تم سے کئی بار کہا ہے میری بیٹی کا خیال چھوڑ دو۔"
اور اس کی باولی بیٹی کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ اس کا باپ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔
"اس وقت تک یونہی بیٹھے رہو نوجوانو، جب تک تمہارے والدین تمہیں گھیرے جانے کو نہ آئیں تاکہ وہ تمہیں ساتھ لے جانے کی بجائے دراصل تمہارے محبوب کو لے جائیں، اور یوں غلطی غلطی میں تمہارے محبوب کی محبت کی ذمہ داری کو قبول کر لیں۔
"میں آپ سے ایک اور سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔" ہم دونوں کے لیے بھنگ آگئی تو پروفیسر نے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔
"کیا آپ واقعی جیوتشی ہیں؟"
جواباً میں غٹ غٹ اپنا بھنگ کا گلاس چڑھا گیا۔
"میرا سوال زیادہ اہم ہے۔" سائنس داں نے خلا سے لوٹ کر پوچھا۔ "کیا آپ کے ملک میں ہر شخص گانجا پیتا ہے؟"
میں نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا تو وہ فوراً بولا۔ "میں دراصل اپنے سوال کا جواب نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ہیں اپنا سارا گانجا دیدیجئے اور ہمارے سبھی جنگی ہتھیار لے لیجیے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔

کیا آپ کے پنجسالہ قومی پلان یا دس سالہ یا نہ جانے کتنے سالہ ـــــ اخبار کی سبھی خبریں مجھے بریک فاسٹ کے بعد بھول جاتی ہیں ـــــ کیا مشرق کے قومی پلان صرف اس لیے تیار کئے جاتے ہیں کہ اُن سے زیادہ سے زیادہ ـــــ جنگی ہتھیار اسٹور ہو سکیں ـــــ "

پروفیسر نے اس کا تعارف، رچی، کے نام سے کروایا تھا ـــــ رچرڈ مین۔ ! تو یہ ہے رچرڈ مین ـــــ وہ اپنی حکومت کے جدید ترین اور مہلک ترین ہتھیار ڈیزائن کرتا تھا۔

مَیں نے اپنی جیب سے نایاب جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ نشہ آور گولیوں کی ایک شیشی نکال کر اسے پیش کی اور مشرقی صناعی سے لہجہ میں خلوص بھر کر کہا۔

"آپ کبھی کبھی اِس شیشی کی ایک گولی چوس لیا کریں۔ منہ میں رکھتے ہی مارز میں جالینڈ کریں گے۔"

"تھینک یو! " اس نے مجھ سے شیشی لے لی "مشرق کا ہر باشندہ نشوں کا بادشاہ ہے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کے عظیم کانٹی نینٹ میں لوگ تمباکو اور چونے کا پلاسٹر بنا کر کھا جاتے ہیں ـــــ"

"اسی لیے ہر مشرقی کسی عظیم مانومینٹ سے کم نہیں" پروفیسر نے کہا "میں ایک اور سوال پوچھنا چاہتا ہوں ـــــ " پروفیسر کے دل میں جو بھی خیال آتا بھنگ سے اڑکر اس کے منہ پر آجاتا "مشرقیوں کو اس لیے تو اتنی بھوک محسوس نہیں ہوتی کہ وہ نشہ بہت کرتے ہیں ـــــ کیا شاندار موت ہے ـــــ اگر آپ جیوتشی ہیں تو میرا ہاتھ دیکھ کر بتائیے کہ کسی مشرقی ماں کے پیٹ سے کب پیدا ہوں گا"

سائنس داں رچرڈ مین نے میری شیشی سے ایک گولی نکال کر منہ میں رکھ لی اور اُس کی نشہ آور لذت سے سرشار ہو کر کہنے لگا۔

"مجھے یہ بتائیے مسٹر۔ آئی ایم ساری! آپ کو میں کس نام سے پکاروں؟"

میں نے اپنا نام بتایا۔

"مسٹر رام پرشاد! آدمی نے اپنی دنیا کو تہ و بالا کرنے کے لیے اتنا سامان سجا لیا ہے کہ میں چاہتا ہوں ہماری سبھی ہوئی موت بہیں توڑ پھوڑ کر خود بھی جلد از جلد ٹوٹ پھوٹ جائے۔ جو ہونا ہے وہ فوراً ہو جائے تاکہ ہم از سر نو اپنی زندگی شروع کر سکیں۔ ہم اپنی تباہی کی طرف اتنا آگے بڑھ آئے ہیں کہ تباہ تو بہر صورت ہمیں ہونا ہی ہے۔ جتنی جلدی ہم تباہ ہوں گے اتنی جلدی اپنی نئی زندگی شروع کر سکیں گے ـــــ " میری گولی چوس چوس کر اس نے مجھے عالم بالا سے آواز دی۔

"میں مارز یا مون یا نہ جانے کہاں سے بول رہا ہوں مسٹر رام پرشاد ـــــ او۔ ڈر! مجھے بتاؤ کیا میں سارے بم کرۂ ارض پر پھینک دوں؟ آرڈر دو پلیز! او۔ ڈر۔!

"کیا آپ واقعی جیوتشی ہیں؟"

اور جب میں نے اثبات میں سر ہلایا تو پروفیسر کو اپنی طرف شک بھری نظر سے دیکھتے ہوئے پا کر چونک پڑا۔

آپ کو تعجب ہوگا مگر جیوتش اور نشوں کی سوداگری میرے اضافی کام ہیں۔ میں ایک ذی الأس بین الاقوامی ــــ جاسوس ہوں اور دنیا کی کئی حکومتوں، اداروں شخصیتوں کی خدمات انجام دے چکا ہوں۔ جاسوسی میرا پیشہ ہے۔ اسی ٹوہ لگانے کے پیشے نے مجھے پہلے پہل جیوتش اور فلسفے کی طرف راغب کیا لیکن جیوتش اور وچار دھارا میں جٹ کر مجھے محسوس ہوا کہ میں ہوا میں کھیتی باڑی کر رہا ہوں (میرا باپ ایک مشرقی کسان تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم اکثر قحط کا شکار ہو جاتے ــــ اداس کی وہ شام۔ ہمارا کبھو کا کنبہ بھگوان کرشن کی مورتی کے سامنے بیٹھا تھا۔ میری ماں گیتا پڑھ رہی تھی اور ہم جاں بلب ہو کر سن رہے تھے، گویا مرنے سے پہلے ہم اپنی مکتی کا سامان ڈھو رہے ہوں، بھوکوں مر رہے ہوں، ہمارے کھانے کے لیے صرف وچار ہی ہوں)

میری جاسوسی کی دلچسپیاں بڑھنے لگیں تو میرے روحانی ایڈونچر ارضی نقوش اختیار کرنے لگے، جیسے روح مٹی میں آباد ہو کر جی اٹھتی ہے یا خیال چہرے میں پناہ لے کر شناسا معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ میری سراغ رساں عادات کا نتیجہ تھا کہ آما کا کھویا ہوا خیال مجھے اچانک جیوا کے چہرے میں مل گیا۔

(جیوا کو اب تک آ جانا چاہیئے تھا)

جیوا جب پہلی بار مجھ سے ملنے آئی تو ایسی شکل بنا کے، جیسے وہ میری کوئی موکل ہو، لیکن بے چاری کو معلوم نہ تھا کہ اس کی کوئی بھی صورت تماشائی کے ذہن میں اس کی اپنی ہی خواہش سے ابھرتی ہے۔ میں نے اپنی آدھی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور آدھی نظر سے اسے دیکھنے کے لیے اپنے ذہن میں، اور مجھے وہ اپنے مانند صاف کوئی جاسوس معلوم ہوئی ــــ آما مجھے ڈھونڈ رہی تھی اور جیوا کسی غیر ملکی ڈپلومیٹ کی ہدایت پر اس پر اسرار جاسوس کو، جس سے چند ٹاپ انٹرنیشنل سیکرٹ مہیا ہو سکتے تھے۔

میں جیوا کی طرف پیٹھ کر کے آما پر جھک گیا۔ جس طرح دو عورتوں کے سامنے آپ اُن میں سے ایک سے محبت کریں تو دوسری آپ کا پیار جیتنے کے لیے بیقرار ہونے لگتی ہے، ویسے ہی ایک ہی وجود میں دو عورتیں ہوں تو ایک کے لیے آپ کی چاہ دوسری کو بھی آپ کا شیدائی بنا دیتی ہے۔ اپنی طرف میری پیٹھ دیکھ کر پہلے تو جیوا کو بھی اپنی ڈیوٹی کا ہی خیال آیا۔ اس کی چور نظریں سیکرٹ پیپرز کی دست یابی کے لئے ہر طرف اٹھیں۔ اس کی بیک وقت سب کچھ دیکھ لینے کی بے تاب خواہش نے اتنا کھٹکا کیا کہ سویا ہوا آدمی بھی ہڑبڑا کر جاگ اٹھے اور لاٹھی لے کر دوڑ پڑے مگر میں بڑے انہماک سے آما پر جھکا رہا کیونکہ میں اپنا کوئی سیکرٹ پیپر کہیں نہیں رکھتا میرے سبھی راز میرے اندر ہی مقفل پڑے ہوئے ہیں؛ فائر آرم کے فلیٹ کے اگلے دو کمرے میرے جیوتش کے دفتر کے لیے وقف ہیں، ان کے پیچھے دو اور کمرے نشوں کے دھندے کے لیے، مگر میرا جاسوسی کا سالم دفتر میرے ذہن میں آ رہا ہے۔ یہ سارا کام میں اطمینان سے یہیں بیٹھ کر کرتا ہوں ــــ جیوا نے آخر اپنی تلاش میں ناکام ہو کر تعجب سے میری

• خدا بیچارہ تو بیمار پڑا ہے، وہ حفاظت کیا کرے گا • اس ہلکے پھلکے موضوع سے وہ اتنی متانت برت رہی تھی کہ میرا جی چاہا کہ ہنس دوں۔

• میں تو چاہتی ہوں رام، کہ ہمارا بوڑھا اور بیمار خدا اب چل بسے — تاکہ ہماری جینے کی پوری ذمہ داری ہم ہی پر عائد ہو —

کبھی کبھی جیوا معمولی باتوں کو اتنے اجنبی اور ڈرامائی سیاق و سباق سے جوڑ دیتی ہے کہ بڑی اَن پروفیشنل معلوم ہوتی ہے۔

خدا کی بیماری، جینے کی ذمہ داری — اس کا بھلا یہاں کیا موقع ہے! بڑی محبت سے اپنے دوست کے بچے کا بوسہ لو، پھر اس کے حسن اور خوب صورتی پر ریجھ ریجھ کر ایک اور بوسہ لو اور پھر — ہیلو، بے بی! یہ لو بوڑھا بابا! دیکھو، کیسے سر ہلا رہا ہے — ! ہہ ہہ ہا ہہ — ! یہ لو — ہہ ہہ ہہ ہا! دھادھم — م — م م۔ بچہ ہوائی جہاز کی سیٹ میں لیٹے لیٹے سو گیا ہے اور سوتے میں بھی بوڑھے بابا کا ہلتا ہوا سر دیکھ دیکھ کر ہنس رہا ہے اور بڑے پیار سے بابا کو اپنے دل کے قریب لے آیا ہے — دھا — دھم م م —!

بیمار خدا کے سرہانے جیوا کھڑی میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے!

یہ اتنے سارے لوگ — یہ طالب علم، جو اپنی انجینیرنگ کی تربیت سے فارغ ہو کر وطن لوٹ رہا تھا' اس کے بوڑھے ماں باپ پھولوں کے ہار لئے اپنی بوڑھی رگوں میں ہوائی جہاز کی گھوں گھاں محسوس کر کے آسمان کی خالی خالی نیلاہٹ میں تک رہے ہیں۔ اور یہ ادھیڑ عمر ٹورسٹ، جو روزمرہ کے کام سے تھک کر زندگی سے چھٹی لے کر چلا آیا۔ اور یہ بزنس مین، یہ سول سرونٹ، یہ ہاؤس وائف، یہ معصوم خوابیدہ بچہ، یہ اس بچے سے بھی معصوم اس کے والدین یہ بہتر لوگ، یہ بہتر کروڑ لوگ، بہتر اَرب یا بہتر کھرب لوگ، زندگی کا یہ ہیجان بازار، یہ پاپولیشن ایکسپلوژن! ایک چھوٹے سے بم کے ہیبت ناک دھماکے نے اس ساری ٹیمنگ لائف کو اس کی محفوظ دستوں کے اندر ہی ختم کر دیا ہے۔ موت کی بے نام دستوں میں زندگی سے بھاگے ہوئے اتنے زیادہ مہاجرین کے سائے پھڑپھڑانے لگے ہیں کہ مر کر بھی جینا ناممکن ہو گیا ہے!

جیوا میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے! دھرتی ہر بھونچال کے بعد ویسی ہی نو بہ نو نکل آتی ہے، کنواری، شگفتہ، زرخیز — ! جیوا کی چلبلی مسکراہٹیں دیکھ دیکھ میں بالکل بھول جاتا ہوں کہ وہ اپنے بیمار خدا کی موت کی دعائیں مانگ مانگ کر اس کی تیمار داری کر رہی ہے، گویا میرا من باپ مر رہا ہو اور میں اس سے غافل ہو کر اپنی محبوبہ کی طرف دیکھے جا رہا ہوں جو میرے باپ کو بہلا بہلا کر بڑی محبت سے زہر پلا رہی ہے اور جس کی مسکراہٹیں مجھے دیکھے جا رہی ہیں۔

آ ما! آ ما! آؤ، بوڑھے کو مرنے دو! آؤ، ہم ساتھ کے کمرے میں تھوڑی دیر کے لیے ایک بستر پر لیٹ جائیں۔ آؤ۔ ؤ!

(نہ جانے جیوا ابھی تک کیوں نہیں آئی۔ ہوائی جہاز کو روانہ ہوئے اب پورا ایک گھنٹہ ہو چکا ہے
ـــــ کہیں ـــــ ؟ نہیں۔ !)
ک۔ ٹک !
اپنے آفس سے لفٹ کے رکنے کی آواز سن کر میں نے اپنے جسم سمیت دروازے کی طرف پرواز کی ہے
وہ آرہی ہے ! اپنا کام ختم کر کے آرہی ہے !
وہی آرہی ہے !
مگر ـــــ م ـــــ ؟ !
میں نے اپنی آنکھیں جھپکی ہیں۔
جیوا پولیس کی وردی میں ملبوس ہے اور اُس کے ہاتھ میں ایک پستول تنا ہوا ہے جو موت کی طرح چل جانے کو بے قرار ہے، اور اُس کے ساتھ چند اور پولیس آفیسر ہیں اور ان کے ہاتھوں میں بھی پستول تنے ہوئے ہیں۔ وہ سب میرے جیوتش کے آفس کی طرف بڑھ رہے ہیں اور مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں اپنے گھومتے ہوئے سلیری گلوب پر کھڑا گرنے سے بچنے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔ میری تقدیر کی طرح میرا یہ جیوتش کا دفتر گھوم رہا ہے اور میں اس کے پیچھے اپنے نشوں کے دفتر کی طرف بھاگ جانا چاہتا ہوں اور پھر وہاں سے اپنے پرائیوٹ سوٹ میں، جہاں میں کسی بڑے نیک آدمی کے مانند آما کے ساتھ اپنی پرائیوٹ اور سیلے قصر زندگی بسر کرتا ہوں، مگر آما تو پولیس آفیسر بنی میرے جرائم کا حساب چکانے آرہی ہے۔ آما تم جانتی ہو میرے جرائم کا ذمہ دار تمہارا پیار خدا ہے ! آما، میں برا ہوں مگر میری برائی میری نہیں، تمہارے پیار خدا کی ہے، صرف میری نیکی میری ہے۔ آما ! آما ـــــ ا ـــــ م ـ !
"ہینڈز اَپ !"
میرے کوٹ کے نیچے ہمیشہ دائیں کندھے سے چھاتی کی طرف بجلی کا ایک بٹن لٹکا رہتا ہے، میرے اعمال کے حساب کتاب کا فرشتہ
"ہینڈز اَپ !"
ہاتھ اوپر کرتے ہوئے میں نے یہ بٹن دبا دیا ہے اور کچھ سوچنے سے پہلے ہی الیکٹرک کرنٹ سے میرا ذہن میرے کاروبار کا یہ سارا دفتر خاکستر ہو گیا ہے !
اور میری روح، فائر آرم کی کھڑکی سے پرواز کرنے سے پہلے جیوا کی آواز سن کر رک گئی ہے۔
"بہت بڑا سپائی تھا مگر لائف کو ڈسچ کا بائیڈ آفٹ سمجھ بیٹھا۔ !"
میں نے جی بھر کر جیوا کی طرف دیکھا ہے، اس تریم میں دھڑکتی ہوئی آما کی طرف !
زندگی اپنے آربٹ میں گھوم رہی ہے اور تھک تھک کر دم بہ دم تازہ دم ہو رہی ہے، موت

کا ایک نقطہ بھی کہیں نظر نہیں آرہا۔

میں نے بے اختیار چاہا، کاش اِس آربٹ میں پھر سے داخل ہوسکوں۔! مگر میرا جسم کہاں ہے۔! دل کے بغیر میری موت کیونکر دھڑکے گی ؟ دماغ کے بغیر میں اپنی زندگی کو کیوں کر محسوس کروں گا ——؟ میرا جسم مجھ سے چھن چکا ہے —— میرا جسم مجھ سے۔!

میرا بے جسم بھوت ایک بے آواز چھرے بے سمت کہیں اڑنے لگا ہے۔

مَیں نے زندگی بھر موت کو بے سود ڈھونڈا ہے اور مر کر بغیر کسی کوشش کے موت کا سراغ پالیا ہے!

سہن سکھوں کا

"ایک بات پوچھوں کھیا؟"

خوشیا اور روپیا دونوں رانا صاحب کے گھر میں پرانے نوکر ہیں۔ اور رانا صاحب نے اپنے بنگلے کے پچھواڑے دو گراجوں میں سے ایک انہیں رہنے کے لیے دے رکھا ہے۔

"ہمرے رانا ساب کے بارے میں تورا کا کھیال ہے؟"

"بوہت اچھا کھیال ہے۔" خوشیا کھاٹ کی پائنیتی بیٹھ کر اپنی بیوی کی پھٹی ہوئی ایڑیوں میں سرسوں کا تیل بھر رہا ہے۔"بوہت ہی اچھے آدمی ہیں۔"

"وہ تو مو بھی مالوم ہے مورکھ — ٹھہرو، پہلے موری بات کا جواب دو۔ موری ایڑیاں کوئی بھاگی نہیں جا رہی ہیں!"

"ہمرے رانا ساب بھی کدھر بے چارے بھاگے جا رہے ہیں؛ موری کھالس چاندی کی روپیا! اُسے اپنی بیوی کو پیار جتانا ہوتا ہے تو اُسے کوئین وکٹوریہ کے پرانے چاندی کے روپے سے تعبیر کرتا ہے۔ ڈاپی ریج پر بھرا بھرا ابوا ابن کے پڑے ہوں گے۔"

"ہاں، پر موری سمجھ میں نہیں آتا کے بھڑوی اتنی دولت کس کام کی، جب جرا بھی کھسی نہ ہو۔ ہاں اس سوراکھ میں اور تیل بھرو، بڑا سکھ آ رہا ہے — ! تورے بچے جیئیں۔"

"کون سے بچے روپیا؟" خوشیا اپنی پرانی شکایت دہرانے کے لیے تیل ڈالتے ڈالتے رک گیا ہے۔

"کبھی کوئی چڑیا کا بچہ بھی جن کر دیو تو جانوں۔"

"اس گھور بڑھاپے میں اب مجے اور جان کے کیا لیوگے مورے باپ؟"

ایک دن اچانک اُسے شوہر کے چہرے پر کئی جھریاں محسوس ہوئیں تو اس کے مرحوم باپ کا سالم چہرہ اس کی شاداں آنکھوں سے برآمد ہو کر خوشیا کے منہ ماتھے پر جڑ گیا ـــــ ہائے، تم تو مورے بپرے کے پورے باپ نکل آئے ہو کھُسیا! ـــــ تو اس میں کھُس ہونے کی کا بات ہے روپیا؟ تم ہی تو موری اِس دسا کا کارن ہو ـــــ میں نے کا کیا ہے؟ ـــــ جو توری ماں نے تورے سارے باپ کے ساتھ کیا تھا۔ پر وہ مرنے سے پہلے کم سے کم تو ہے جن کے تورے باپ کو کھُس تو کر گئی، تم نے کا کیا؟ ـــــ میں کا کرتی، کرنا تو سب کچھ تو ہے ہی تھا کھُسیا۔

"مر کیوں گئے ہو؟" روپیا نے اپنی پھٹی ہوئی ایڑی کو شوہر کی آنکھوں کی طرف لہرا کر کہا ہے۔ "اور تیل ڈالو ـــــ میں پوچھوں کھُسیا ـــــ ہمرے بچہ نہیں ہوا تو کا ہوا؟ ـــــ نہیں، اچھا ہی ہوا کے نہیں ہوا ـــــ ہمرے رانا ساب کی جالم بہو کس تراں ان کی چھاتی پر مونگ دلتی ہے۔"

"کل سویرے مونگ کی دھلی ہوئی دال بناؤ روپیا۔"

"تو ہے کھانے کی پڑی ہے۔"

"میں کھا تھوڑی رہا ہوں؛ سر پچھ بات کی ہے"

"تو رانا ساب کی بات کرو۔ ان کا کٹا ہوا سینہ دیکھ دیکھ کے مورا تو جی چاہتا ہے بھوت بن کے بہو کے سر پر سوار ہو جاؤں اور اُسے سکھتی سے ہکم دوں، چلو رانا ساب کی سیوا کرو، نہیں تو کلیجہ نکال کے کھا جاؤں گی۔"

"بھوکی رہ جاؤ گی روپیا۔ بہو کے کلیجہ ہی کدھر ہے!"

"چلو وہ تو پرائی بیٹی ہے۔ رانا ساب کا اپنا کھون بھی کون سا اپنا ہے؟"

"اس میں رانا ساب کا کا دوس روپیا؟ دوس تو تم اُورت جات کا ہے۔ جو کھاوند کے ہوتے ہوتے اُسک کے پیچھے بھاگتی پھرے ہے۔"

"یہ بات ہے کھُسیا، تو پھر روج رات کو سونے سے پہلے مورے پیر دھویا کرو۔" روپیا نے اپنا تیل سے لتھڑا ہوا پیر خوشیا کے ہونٹوں پر رکھ دیا ہے۔

"توری پھٹی ایڑیوں میں تیل جو ڈال رہا ہوں۔" خوشیا نے اُس کے پیر کو بڑی محبت سے اپنی ہتھیلیوں میں لے لیا ہے۔

"بچہ جنوں گی تو تورا، ورنہ اپنی کھالی جھولی ہی آنکھوں سے لگا کے کھُس ہو جاؤں گی۔ جو بھی ہے، مورا کھُسیا تو ہے۔ آؤ، لیٹ جاؤ!"

"نہیں، ابھی دوسری ایڑی میں تیل بھرنا ہے۔"

کا بھائدہ کھیا؟ تم اتنا جتن کرتے رہتے ہو میری ایڑیاں تو جوں کی توں پھٹی رہیں گی — کا تو بے ڈر ہیں لگے کھیا کے میری ایڑیاں بھر گئیں تو میں کسی آسک کے ساتھ بھاگ جاؤں گی۔"

"اب کا بھاگو گی میری کھالس چاندی کی روپیا — اور بھاگ بھی گئیں، تو تورے سنگ اک کھیا کے سوا اور کاٹ بھی کون سکتا ہے؟ تورے پرانے آسکوں کی پوری پلٹن میں سے ایک بھی —"

"میں نے کس موئے آسک کو اپنی راہ پر آنے دیا نا سکرے؟" وہ اس کے ہاتھ سے اپنی ایڑی چھڑوا کر کھاٹ پر سیدھی ہو کے بیٹھ گئی ہے۔

"مو جھے!" خوشیا تیل کو اپنی دونوں ہتھیلیوں میں جذب کرنے لگا ہے۔

"تو ہے تو دیکھتے ہی میں نے اپنا کھاوند مان لیا تھا۔ کھاوند کوئی آسک تھوڑا ہی ہوتا ہے آؤ لیٹ جاؤ۔"

روپیا پھر کھاٹ پر دراز ہو گئی ہے۔

"نئیں، مورے ہاتھ لتھڑے ہوئے ہیں، لاؤ دوسری ایڑی ادھر کرو۔"

"کھیا!" بچیا رگی کچھ خیال آنے پر وہ اٹھ بیٹھی ہے۔ "مرے ہوئے کی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ پر بری بی بی جی نے بھی رانا ساب کو بہت دھوکہ دیا — ایڑی کو ابھی رہنے دو پہلے موری بات سنو — وہ بڑی بڑی مونچھوں والا آیا کرے تھا نا — ارے بی بی جی جسے بھائی جی بولا کرے تھیں — کئی سال پہلے کی بات ہے۔ پر آج وہ سارا نجارا موری تیلیوں میں گھوم آئے ہے۔ ایک دن میں نے بی بی جی کو اور اسے —"

"چھوڑو، مرا کا لیناد ینا۔ لاؤ اپنی ایڑی ادھر لاؤ۔"

"لو — کھیا، بی بی جی کا سر پھرا ایک ہی بھائی نہ تھا، اور بھی تھے۔ آئے دن وہ اپنا آدمی بدلے تھیں، ہر نئی ساڑی کے ساتھ اسی رنگ کی بندیا، اسی رنگ کے بندے، چوڑیاں، جوتے۔ اور آدمی!"

"اچھا ہی ہے روپیا، کے توری کبھی ایک سے جیادہ ساڑی ہوئی ہی نہیں۔"

"ہاں، میں تو اسی ایک کو دھو دھو کے پہنے ہوں۔" وہ اپنے خوشیا پر آنکھیں ٹکا کر مسکرا دی ہے۔ "مگر دھل دھل کر اب اس کے تار سالم نہیں رہے۔"

"پرانے جمانے کا کپڑا ہے روپیا، ٹوٹنے بھی لگے ہیں تو ٹوٹتے ٹوٹتے ہی ٹوٹیں گے۔"

روپیا کے سر میں خارش ہونے لگی ہے اور اپنے بالوں میں انگلیاں کھجاتے ہوئے اس نے کہا ہے۔

"بی بی جی کی کتیا حرامی نہ جانے کب مرے پیچھے گی؟ اس کی جوئیں مورے سر میں گھس آئی ہیں۔"

"کیوں اس بے جبان پر کھا مکھا الجام دھر رہی ہو؟" کتیا خوشیا کی چہیتی ہے "اپنے سر کو تو تم ساپھ نہیں رکھتیں۔"

"اتنی ہی پیاری ہے تو جاؤ اس سے سادی بنالو! جیسے بھی ہو، توری پلّوں کی کھواہس بھی پوری کر دے گی۔"

خوشیا ہنسنے لگا ہے۔ "اورت جات ہو نا، کتیا سے جلنے سے بھی باج نہیں آتی۔"

"موری جوتی جلے ہے۔" روپیا نے اُسے اپنا ننگا پیر دکھایا ہے: "جاؤ اُدھر سے کنگھی اٹھالاؤ۔"
خوشیا نے اُٹھ کر اسے کنگھی لادی ہے وہ اپنا سر چھیلنے لگی ہے اور خوشیا اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کی ایڑی میں پھر آہستہ آہستہ تیل بھرنے لگا ہے۔
"کھسیا۔" بڑی مختصر خاموشی کے بعد روپیا نے پوچھا ہے: "کا رانا ساب کو مالوم تھا کے ان کی بیوی ـــ؟"
"مالوم تو تھا روپیا، لیکن بی بی جی کے سامنے اُن کی دال نہ گلے تھی۔"
"جب آگے پیچھے انڈوں توشوں کی پلٹیں ہوں تو رانا ساب کو دال وال سے کا گرج؟"
"ہاں، کچھ بھی ہو ہمرے رانا ساب اپنے آرام اور کھوراک میں پھرک نہیں آنے دیتے۔"
"پھرک آنے دیں تو اپنے دکھ کا سہن کیسے کریں؟"
"سہن تو اس تراں ہوتا ہے کھسیا کے ہم کھل کر رو دھولیں۔"
"لیکن رونے دھونے سے صحت پر بُرا اثر پڑے ہے پگلی۔ اس لیے بڑے لوگ دکھی ہوں تو جور جور سے ہنستے ہیں اور بوہت اچھا کھاتے پیتے ہیں۔ متبل یہ کے دکھوں سے صحت کھراب نہ ہو۔"
"ہاں رانا ساب کی صحت تو بوہت اچھی ہے۔" اسی اثنا میں روپیا کو کنگھی میں کلبلاتی ہوئی ایک جوں نظر آگئی ہے جسے فوراً انگلی اور انگوٹھے میں لے کر وہ مسل دیتی ہے: "دکھوں کی پال پوس تو موٹے آدمیوں کا کام ہے کھسیا، ہم انھیں مسلتے نہ جائیں تو کھون پی پی کے ہمیں کھالی کردیں۔ آؤ ـــ لیٹ جاؤ ـــ۔"

دریاؤں پیاس

بے بے اپنے اکلوتے بیٹے کے نئے بنگلے کے باہر برآمدے میں چارپائی پر اکیلی بیٹھی ہے اور سوچوں میں ڈوبی ہوئی ہے اور اس کے چہرے کی جھریاں واقعات کے بوجھ سے لٹک لٹک کر چارپائی کے چوبی پایوں میں دھنس آئی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ پایوں کی پرانی لکڑی جھریوں کے اندر ہی اندر پھٹ کر یکبارگی ڈھے جائے گی۔

بے بے نے سر اٹھا کر اپنے سامنے دیکھا ہے لیکن اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے، وہ اندھی نہیں، دھندلائی نظر کو سمیٹ کر ابھی دیکھ لیتی ہے مگر اس کا کیا کیجیے گا کہ اس کی آنکھوں پر ہر دم پرانے مناظر کا پردہ لٹکا رہتا ہے — ان کی وہ جدی حویلی جس کے اندر ایک کے بعد ایک بیسیوں کوٹھڑیاں کھلتی چلی جاتی ہیں اور اور — اور — بے بے ذرا سی مسکرا دی ہے تو اسی لمحے اس کی جھریوں کے کھنچے ہوئے کنارے چارپائی کے پایوں سے اس کے چہرے میں لوٹ آئے ہیں اور وہ اپنے چہرے میں پوری کی پوری نظر آنے لگی ہے — اور — اور اس کا شوہر اسے یکے بعد دیگرے ہر کوٹھڑی میں ڈھونڈتے ہوئے بے سدھ ہوتا جا رہا ہے اور وہ یہاں اس کوٹھڑی میں بیٹھی بے اختیار ہنسنے لگی ہے — اور اس کا شوہر اس کی جھنکارتی ہوئی ریشمیں ہنسی کے پیچھے دوڑ کر اسی کوٹھری میں جا داخل ہوتا ہے اور اسے اپنے بازوؤں میں کس کر لپیٹ لیتا ہے —

بے بے کے چہرے پر اس وقت حویلی کی سالم تصویر کھنچی ہوئی ہے اور اس کی ہنسی یہاں ایک سے دوسری کوٹھڑی میں چھن چھن بھاگ رہی ہے اور اس کی چارپائی نے چیں چیں کر کے اسے بار بار سمجھانا چاہا ہے، بے بے، اپنی عمر کا لحاظ کرو بے بے، پہلے ہی سب لوگ تمہیں پاگل کہتے ہیں۔ مگر بے بے اس وقت بے بے کہا

ہوتو چارپائی کی بھی سن لے :

میں تو گھبرا گیا تھا کہ کہاں کھو گئیں۔

جہاں بھی کھو جاتی انہی کوٹھریوں میں کہیں ہوتی ـــــ وہ ہنس ہنس کر اپنے شوہر کو بتا رہی ہے ـــــ اب تو مر کر بھی انہی کوٹھریوں میں کہیں رہ جاؤں گی ـــــــــــــــ دیکھو حویلی کی چابیوں کا گچھا یہاں میرے پلّو سے ہی بندھا ہوتا ہے، شاید کسی بند کوٹھڑی میں تمہاری راہ تکتے تکتے سدا کے لئے سو جاؤں۔

بے بے بے چینی سے چارپائی پر نیم دراز ہو گئی ہے اور دوپٹے کے پلّو کو چھاتی کی طرف بڑھا کے چابیوں کے ایک بہت بڑے گچھے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ چابیوں کا لوہا اس کی انگلیوں کی برس ہا برس کی پیہم ملائم رگڑ سے گوشت پوست سا ہو گیا ہے اور ہر چابی کے جسم سے اسے اس کی روح جھانکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ـــــ یہ چابی رسوئی خانے کی ہے ـــــ کئی بار کہہ چکی ہوں کم از کم کھانے کے وقت پہنچ جایا کرو، پر میری کون سنتا ہے؟ ـــــ آ گئے؟ ـــــ ٹھہرو! ـــــ آئی ـــــ آ ـ گئی! ـــــ اور یہ چابی ـــــ اس کوٹھڑی میں میرا منّا پڑھا کرتا ہے ـــــ وہی بات ہوئی نا ـــــ دیکھو لالٹین سرہانے جل رہی ہے اور تمہارا منّا کتاب کو دونوں ہاتھوں میں تھامے مزے سے سو رہا ہے ـــــ تم تو یونہی بے چارے کے پیچھے پڑے رہتے ہو، کیا معلوم وہ سپنے میں بھی پڑھ رہا ہو ـــــ نہیں بے بے، میں ایک منّے کا باپ ہو گیا ہوں پھر بھی تم مجھے ابھی تک وہی منّا سمجھتی ہو ـــــ مجھے میرے نام سے پکارا کرو ـــــ تمہیں تمہارے نام سے پکارنے کی سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے اپنے بیٹے کو پکارنے کی بجائے بہو کے شوہر کو بلا رہی ہوں ـــــ تو پھر مجھے اپنی بہو کا شوہر ہی سمجھ کے بلایا کرو بے بے ساری عمر تمہارا منّا بن کے کیسے رہ سکتا ہوں؟ ـــــ

بے بے کی انگلیوں کی پوریں منّے کی پڑھنے کی کوٹھڑی کی چابی پر سے تھرتھراتے ہوئے اپنے شوہر کی کام دھندے کی کوٹھڑی کی چابی کو چھونے لگی ہیں ـــــ آؤ منّے کی بے بے، آؤ، رک کیوں گئیں؟ ہائیں! رو کیوں رہی ہو؟ مجھے بتاؤ میں سب کچھ ٹھیک کر دوں گا۔ اپنا سارا دکھ میرے حوالے کر دو، میرے ہوتے ہوئے تم کیوں رو رہی ہو؟ ـــــ یہی تو رونا ہے کہ ایک تم نہیں رہے۔ میں ہوتی تو مر کے بھی تمہاری دیکھ بھال کے لئے رہ جاتی ـــ

بے بے چپ چاپ رونے لگی ہے مگر اس کے آنسو نہ بہہ رہے ہوں تو اس کے سوکھے سمٹے جھرجھراتے بے نقش چہرے سے پتہ ہی نہ چلے کہ وہ رو رہی ہے ـــــ یہ چابی آپ ہی آپ اچھل کر اس کی انگلیوں میں آ گئی ہے اور کوٹھڑی کا پٹ کھل گیا ہے اور لوگ اس کے شوہر کی لاش کو باہر نکال رہے ہیں ـــ نہیں! نہیں! ـــــ اسے آپ ہی جانے دو۔ وہ آپ ہی جاتا ہے تو لوٹ آتا ہے ـــــ نہیں، تم اسے لے گئے تو وہ لوٹ کے نہیں آئے گا ـــ نہیں، اسے مت لے جاؤ۔ میں نے اپنی ساری عمر اس حویلی کے

اندر ہی تباہی ہے۔ مجھے باہر کے راستے معلوم نہیں۔ مت لے جاؤ۔ میں اُسے کہاں ڈھونڈوں گی؟ ___ لوگ کھسر پھسر کر رہے ہیں کہ بے بے پاگل ہوگئی ہے ___ ہاں، میں پاگل ہوگئی ہوں۔ مجھے پاگل ہوجانے دو، نہیں تو میں پاگل ہوجاؤں گی ___

بے بے کی آنکھوں میں ساون رُت اتری ہوئی ہے مگر باہر کا موسم اتنا خشک ہے کہ برآمدے کے سامنے لان سے پرے ایک درخت نے دوسرے سے سرگوشی میں کہا ہے ___ دیکھو، بڑھیا کی جھڑی وہاں پتھر کے فرش پر برس برس کر ضائع ہو رہی ہے۔

ہاں، ہمارے آس پاس کچی دھرتی پر برسے تو ہم سیراب ہوجائیں۔

بے بے چابیوں کا گچھا ہاتھوں میں لیے گویا اپنی ساری پرانی حویلی کو چھاتی سے لگائے ہوئے ہے۔

وہ اپنے دم توڑتے ہوئے شوہر کے سامنے کھڑی روئے جارہی ہے

روؤ نہیں پگلی۔ میرے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔

اُس نے اپنے رونے کی آواز کو سلب کرنے کے لیے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا ہے۔

روؤ مت اور سنو: مرتے دم تک یہیں حویلی میں رہنا۔ مُنّے کو بھی میری یہی ہدایت ہے کہ وکالت پاس کرے تو یہیں رہے۔ اس کی شادی خوب دھوم دھام سے کرنا ___ سُن رہی ہو؟

اسی حویلی میں خوب دھوم دھام سے کرنا۔ اس حویلی میں ہم کئی پشتوں سے رہ رہے ہیں اور شادی یا موت پر ہمارے سبھی باپ دادا یہاں جمع ہوتے ہیں۔ اپنی شادی کے موقع پر میں نے ان آنکھوں سے اُن سب کو دیکھا تھا۔ ان میں میرا سورگیہ باپ بھی تھا، وہی ___ وہ ___ ہی ___ اور سبھی تھے ___ سن رہی ہو؟ ___ تم یہیں رہوگی تو میں جہاں بھی ہوں گا تم میرے ساتھ ہی رہوگی۔ اس حویلی کو کسی صورت نہ چھوڑنا۔ ورنہ ہم بچھڑ جائیں گے ___ وہ دیکھو، وہ سب آرہے ہیں، میرا باپ ___ دادا ___ اس کا باپ ___ سبھی! ___

بے بے واقعی باؤلی ہوچکی ہے۔ بے چاری کو معلوم ہی نہیں کہ وہ ابھی وہیں اپنے گھر میں ہے یا گھر چھوڑ کر یہاں آئے اُسے سالہا سال ہوچکے ہیں تاہم وہ دن اس کے ذہن میں جوں کے توں ہیں: وہ اپنی ساری حویلی کو بند کرکے نکل پڑے ہیں اور اس کا مرحوم شوہر اور سسرال کے کئی پشتوں کے دوسرے لوگ انھیں حویلی کے باہری دروازے پر چھوڑنے آئے ہیں۔ اس کے شوہر کی روح آگے بڑھ کر اس کا کندھا تھپتھپانے لگی ہے ___ جاؤ مُنّے کی بے بے۔ حالات اب اتنے بگڑ چکے ہیں کہ تمہارا جانا ہی مناسب ہے نہیں تو یہ لوگ تمہارا خون بہادیں گے، نہیں، ہماری فکر مت کرو، ہمارے خون ہی نہیں، تو بہے گا کیسے! لیکن حالات درست ہوتے ہی لوٹ آنا۔ باہر کا قفل لگا جاؤ۔ ہم یہاں تمھارے انتظار میں گھڑیاں گن گن کر گزاریں گے۔

نہیں، تم نے آپ ہی مجھے حویلی سے باہر قدم رکھنے سے منع کیا تھا، اب آپ ہی نکال رہے ہو۔
نہیں، منّے کی بے بے۔ بھگوان نہ کرے کسی نے تمہیں قتل کر دیا تو مجھے نرک میں بھی اس کا پیچھا کرنا ہوگا اور
میں وہاں سے لوٹ نہ سکوں گا۔

نہیں!

نہیں، منّے کی بے بے، اس وقت یہاں سے چلی جاؤ۔ تم جہاں بھی جا رہی ہوگی دراصل ادھر ہی آ رہی
ہوگی ــــ جاؤ جہاں بھی بنے، چلی جاؤ، ورنہ ہم سدا کے لیے بچھڑ جائیں گے۔

مادرِ ہند کی کوکھ میں درد کی گٹھڑی کھلی ہوئی ہے اور خون میں لتھڑے ہوئے جڑواں بچوں کو جنم دیتے ہی
اس نے دم توڑ دیا ہے اور ــ اور قیامت بپا ہو گئی ہے ــــ ارے کوئی ان بے ماں معصوموں کو نہلاؤ
انھیں نرم و گرم کپڑوں سے ڈھانپو۔ ان کے آرام و خوراک کی سوچو ــــ لیکن سر پر قیامت آ کھڑی ہو تو
کون کس کی سنتا ہے؟ ہجوم کے ہجوم ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے ہیں اور انسانی جسم کے الگ الگ اعضاء
کا منظر اتنا عام ہو گیا ہے کہ انسان کے پورے وجود سے صرف اس کے بھوت کا ہی تصور بندھتا ہے ــــ
انھی دنوں یہ دو بوڑھے بھوت ــ ایک زندہ عورت کا اور ایک اس کے مردہ شوہر کا ــــ ایک دوسرے
سے وداع ہو رہے ہیں۔ بے بے نے اپنے پلو سے بندھی ہوئی چابیوں کو چھوتے ہوئے اپنی حویلی کی طرف پیٹھ کی ہے
اسے صاف سنائی دیا ہے:

گھبراؤ نہیں منّے کی بے بے، تم کہیں پہنچنے کے لیے یہاں سے جا رہی ہو۔

چلو بے بے ــــ اس کے نوجوان وکیل بیٹے نے اسے سہارا دینے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا ہے۔

نہیں! نہیں ــــ بے بے نے اپنا ہاتھ بڑھا کر کھینچ لیا ہے ــ میرے سارے سہارے
یہیں ہیں۔ اس حویلی میں ــــ وہ لپک کر حویلی کے دروازے پر لوٹ آئی ہے اور چابی نے آپ ہی آپ
قفل کے سوراخ میں دھنس کر قفل کو کھول دیا ہے ــــ نہیں، منے کی بے بے ــــ دروازے کے
کے اندر اس کا مرحوم شوہر ابھی وہیں کھڑا ہے ــ جاؤ!

نہیں!

نہیں، جاؤ!

باؤلی بے بے نے اچانک چپ سادھ لی ہے اور اپنے بیٹے کے پیچھے پیچھے ہو لی ہے گویا اسے معلوم
ہی نہ ہو کہ کہیں جا رہی ہے۔ بس اپنے اندر ہی اندر سوکھی سوکھی رگوں میں لڑکھڑاتے ہوئے اپنی ذات کے
سفر پہ نکلی ہوئی ہے اور جہاں ہے وہیں کی وہیں ہے، یہیں، اسی حویلی میں! ــــ حویلی کے باہر ہر طرف
بارود ہی بارود ہے، آگ ہی آگ بھڑک رہی ہے، دھماکے ہو رہے ہیں لیکن حویلی کا اندرون کتنا محفوظ ہے،
کتنا پُرامن ہے، کتنا آباد ہے!

بے بے کی گویائی پلٹ آئی ہے۔

یں نہ کہتا تھا منے کی بے بے، جہاں بھی جاؤ گی، اپنے آپ یہیں آجاؤ گی۔

ہاں! ـــــ جاؤ، تم آرام کرو۔ مجھے منّے کے لیے دودھ گرم کرنا ہے۔ اس کے کچہری سے لوٹنے کا وقت ہو گیا ہے۔

بے بے! ـــ بے بے! تمہیں کیسے سمجھاؤں؛ مجھے بھی اپنے ساتھ پاگل بنا کر دم لوگی۔

تمہارے دشمن پاگل ہوں منّے، پاگل ہونے کے لیے میں جو ہوں۔

تم تو ہو ہی، بے بے! تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ ہم اپنی حویلی، بستی، دیس ـــــ سرحد کے اُس پار چھوڑ آئے ہیں، کئی سال ہوئے چھوڑ آئے، مگر تم ابھی تک وہیں کی وہیں بسی ہوئی ہو۔

یں اب اور کہاں بسوں گی منّے۔ تم جہاں چاہو، بسو، بسو، میری تو بس پرکھوں کی یہی ایک حویلی ہے۔

بے بے اپنی حویلی کی چابیوں کے گچھے پر پیار سے انگلیوں کی پوریں رگڑ رہی ہے۔

کوئی پاگل بھی اتنا پاگل نہیں ہوتا ہے بے، ابھی تک اپنی حویلی کی چابیوں کا گچھا، پلو سے باندھے پھرتی ہو۔

لو، دُودھ پی لو منّے۔

دودھ پی کر کیا کروں بے بے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ ان چابیوں کو گھما پھرا کے کسی طرح ایک بار تمہیں کھول دوں ـــ جانتی ہو تمہارے پاگل پن کی وجہ سے کوئی لڑکی مجھ سے شادی کرنے پر تیار نہیں ہوتی؟"

ـــ اجی سنتے ہو؟ ـــ اپنی کوٹھڑی سے باہر آؤ۔ دیکھو ہمارا مُنّا اپنی دلہن لایا ہے ـــــ

سنتے نہیں، تمہاری حویلی میں شادیانے بج رہے ہیں۔ کوئی مر کے بھی اتنا بہرہ تو نہیں ہو جاتا ہو گا ـــــ

باہر آؤ۔ آؤ بہو میں تمہاری باتیں تمہارے سسر کے پاس لے جاتی ہوں، بیچارہ اسی چاؤ میں مر گیا کہ کب ہمارا منا وکالت پاس کرے گا، کب بہو لائے گا۔

آؤ بہو، اس کوٹھڑی میں بیٹھا اپنے دھندے کے کاغذ پر لکھنے میں جٹا ہو گا۔ تمہیں دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل جائیں گی اپنا سارا کام بھول جائے گا

آؤ! ـــ بہو! ـــ تھوڑی دیر میرے ساتھ بھی بیٹھا کرو۔ میرا جی چاہتا ہے تم میرے ساتھ بھی باتیں کیا کرو ـــ بے بے، پاگلوں کے ساتھ کوئی کیا باتیں کر سکتا ہے؟ نہیں، منّے میں پاگل نہیں ہوں ـــ میں منّا نہیں ہوں۔ مجھے میرا پورا نام لے کر پکارا کرو ـــ تمہارا پورا نام کیا ہے، منّے؟ ـــ اجی، سنتے ہو؟ ہمارے منّے کا پورا نام کیا ہے؟ بہو! ـــ بہو! ـــ تمہارے پاؤں بھاری ہو گئے ہیں۔ اب کام پر جانا چھوڑ دو۔ کام پر جانا چھوڑ دوں بے بے، تو کھائیں کیا؟ کھانے کی کیا فکر ہے بہو؟ ہماری حویلی اناج کے ذخیروں سے لدی ہوئی ہے ـــــ آؤ میں تمہیں کوٹھڑیوں کے تالے کھول کے دکھاتی ہوں ـــــ بے بے! ـــ بے بے ـــ بے بے! ـــ تم سارے گھر کو پاگل بنا دو گی۔ میرا نہیں تو اپنی بہو کا کچھ خیال کرو ـــ

میری بہو کی برابری کون کر سکتا ہے ؟ — اجی سنتے ہو؟ دیکھو تمہاری بہو نے ہمارا پوتا جنا ہے — دیکھو سارے کا سارا ماتھا ہمارے مُنّے کا سا ہے — یہ دیکھو ٹھوڑی بھی مُنّے کی سی ہے — اجی سنتے ہو! — کیسے دادا ہو؟ اپنی کوٹھڑی سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ دیکھو، ہماری حویلی میں کون آیا ہے ؟ — شور نہیں مچاؤ بے بے، اپنی بہو کو آرام کرنے دو — مُنّے، میں تو — کئی بار کہہ چکا ہوں بے بے، میں مُنّا نہیں ہوں۔
اگر تم منّے نہیں ہو مُنّے، تو میں کس کی ماں ہوں!
جس طرح تم ہمیں اپنے پاگل پن سے تنگ کرتی رہتی ہو بے بے، اس سے تو مجھے اب یہی شک ہونے لگا ہے کہ تم میری ماں نہیں ہو — اجی سنتے ہو! اپنی کال کوٹھڑی سے باہر آکے سنو، تمہارا مُنّا مجھ سے کیا کہہ رہا ہے — ! —

بے بے اپنے بیٹے کے نئے بنگلے کے باہر برآمدے میں چارپائی پر لیٹی بے چینی سے بار بار پہلو بدل رہی ہے اور چارپائی چُوں چُرر کرتے ہوئے کہہ رہی ہے۔ سو جاؤ بے بے، آرام سے سو کیوں نہیں جاتیں؟
ہاں، اب مجھے سو ہی جانا چاہیئے — بے بے نے آنکھیں موند لی ہیں اور سوچنے لگی ہے کہ اس کے بیٹے، بہو اور پوتے کو باہر گئے اب کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب وہ لوٹ ہی رہے ہوں گے، ہاں، لوٹ رہے ہیں۔
بے بے! — بے بے! — ارے دیکھو، — بے بے تو — بے بے تو — بے — بے —
اس کا مُنّا رونے لگا ہے اور اس کی بہو بھی اور اس کا ننھا سا پوتا بھی — نہیں ننھے، تم نہ روؤ، بے بے نے جھٹ آنکھیں کھول کر اس کی طرف بازو پھیلا دیے ہیں مگر وہاں ..... کسی کو نہ پاکر پھر آنکھیں موند لی ہیں اور اپنے اوپر اندھا اندھا سا احساس طاری کرنے لگی ہے کہ وہ مر چکی ہے اور پگلی کو اپنا آپ واقعی پاگل معلوم ہونے لگا ہے کہ محض آنکھیں موند لینے سے کوئی کیونکر مر سکتا ہے۔
پانی!
برآمدے کی دیواروں نے بے بے سے جواباً کہا ہے۔ پیاسی ہو تو آپ ہی ہمت کرو بے بے، ہم کیا کر سکتی ہیں؟
بے بے بڑی مشکل سے چارپائی سے اٹھی ہے اور قریب ہی میز پر رکھے ہوئے پانی کے جگ کو اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ میں لے لینا چاہا ہے اور خالی جگ اس کے ہاتھ سے فرش پر گر کر اس کے غصیلے بیٹے کے مانند زور سے کھنکا ہے،
اور وہ سہم کر چارپائی پر آبیٹھی ہے۔
دیکھو بے بے، ہم تمہارے لیے کیا لائے ہیں۔
کیا لائے ہو ننھے! اپنے پوتے کی آواز سن کر اس نے فوراً مڑ کر دیکھا ہے۔
لیکن وہاں کوئی بھی نہیں —

اُس کی پیاس بڑھ گئی ہے

اور وہ سوکھی سوکھی نظروں سے اپنے سامنے برآمدے سے بنگلے کے اندر سے جاتے والے دروازے کے قفل کو گھورنے لگی ہے جسے اس کے بہو بیٹا لگا گئے ہیں۔

دیکھو، سارے کا سارا ماتھا ہمارے منے کا سا ہے ــــــ یہ دیکھو، ٹھوڑی بھی ویسی ہی ہے ــــــ اجی سنتے ہو؛ ــــــ

ہاں، سن رہا ہوں مُنّے کی بے بے، پر تم کس کی باتیں کر رہے ہو؟ یہ ہمارا مُنّا ہی تو ہے۔ ارے ہاں، یہ تو ہمارا مُنّا ہی ہے۔

اندر آجاؤ، مُنّے کی بے بے، باہر کیوں بیٹھی ہو! ــــــ لیکن گھونگھٹ اوڑھ کے آؤ۔ تمہارے سسر اِدھر ہی آرہے ہیں ــــــ نہیں، اُدھر سے آگے نکل گئے ہیں ــــــ اری آؤ نا ــــــ قفل کھول کے بلا جھجک چلی آؤ ــــــ آؤ، آپ بھی پانی پیو اور مجھے بھی پلاؤ ــــــ آؤ نا!

بے بے میں نامعلوم کہاں سے اتنی پھرتی آگئی ہے اور وہ سرعت سے بنگلے کے اندر سے جاتے والے مقفل دروازے پر آکھڑی ہوئی ہے اور ایک ایک کر کے اپنی حویلی کی ساری چابیاں قفل میں گھما رہی ہے لیکن قفل کھلنے میں نہیں آرہا!

پھول

گنگا نے تم سے کیا کہا ؟

گنگا سو رہی تھی اور سوتے سوتے بہہ رہی تھی اور اس کے دل میں پورن ماشی کا چاند کھلکھلا رہا تھا۔

واہ ! — پھر ؟

پھر کیا ؛ میں کوئی قصہ وصہ تھوڑا ہی سنا رہا ہوں کہ پہلے یہ ہوا، پھر یہ — پھر یہ — وہاں تو جو کچھ ہو رہا تھا، بس ایک دم ہو رہا تھا — لو دیکھ لو ! — یہ ! — گنگا کا پانی آہستہ آہستہ بہہ رہا ہے اور پانی کی تہہ میں پراچین مندروں کی اوندھی پرچھائیاں سیدھی ہو ہو کے سطح کی طرف آ رہی ہیں اور ابھی سطح سے برآمد نہیں ہوئیں لیکن ہمارے خیال میں گنگا کے بیچوں بیچ کھڑی ہیں اور ان کے کلس آسمان کی چھت میں کھبے ہوئے ہیں اور چھت کے اوپر کہیں بارش ہو رہی ہو گی جو ای دکی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔

واہ — ہ !

ہاں، گنگا سو رہی ہو تو اس کے سپنے پھوٹ پھوٹ کر باہر آنے لگتے ہیں — میں بھی بے اختیار واہ واہ کرنے لگا تو ایک ادھیڑ عمر عورت نے — وہ میرے پاس ہی بیٹھی تھی لیکن کچھ اس طرح، جیسے کنارے کی ریت، جس کا کچھ نہ کچھ تو پانی کے ساتھ ساتھ بہا جا رہا ہو اور جو کچھ وہیں رہ گیا ہو وہ پانی سے دھل دھل کر نہایت چمکیلا نکل آیا ہو — گنگا کے کنارے بچھی ہوئی چمکیلی ریت کا کوئی الگ وجود نہیں، وہ بھی گنگا ہی ہے۔ اس عورت کی موجودگی کا بھی مجھے بالکل احساس نہ ہوا۔ وہ بھی مجھے گنگا ہی معلوم ہوئی۔

اس نے تم سے کیا کہا ؟

میں بے اختیار واہ واہ کیے جا رہا تھا کہ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے آہستہ سے شی — ی۔ ی

کر کے مجھے بولنے سے منع کر دیا ـــــ بولو نہیں، اتھاہ ہو جاؤ، متھار ہی بن جاؤ۔
تو پھر کیا تم بھی گنگا بن گئے؟
ہاں، گنگا میں ڈوب کر گنگا ہی بن گیا اور میرے کناروں پر آباد میری ساری فانی کائنات غرقاب کا منظر پیش کرتی رہی۔
مگر اس وقت تو تم میرے سامنے ویسے ہی مٹی کے مٹی زندہ کھڑے ہو
نہیں، ویسے ہی نہیں۔ ہر لمحہ ہماری مٹی کا کوئی نہ کوئی ذرّہ بہائے جاتا ہے۔ ہمیں ساری عمر اسی لیے بھوگنا ہوتی ہے کہ ذرّہ ذرّہ بہہ کر امر ہو جائیں۔
امر ہو جائیں؟
ہاں، خاکی کا نام و نشان ہی باقی نہ رہے تو اُسے کیا ڈر، کہ اس کا نام و نشان مٹ جائے گا موت کا ڈر تو اس وقت تک ہے جب تک آدمی زندہ ہے۔
تمھاری یہ اناپ شناپ میری سمجھ سے باہر ہے۔
ہاں، میں بھی اپنی پنڈتائی کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا ہوں۔
تو پھر اپنی باتیں چھوڑو۔ مجھے صرف یہ بتاؤ گنگا نے تم سے کیا کہا؟
بتا تو دیا کہ میں گنگا میں دوبارہ گیا۔
ہاں، گنگا تو سوتے جاگتے اپنی سطح پر بہتی رہتی ہے مگر تم ناحق اس کی تہوں میں ڈوبے رہ گئے۔
ـــــ آؤ ادھر ہر کی پاوڑی پر جا کے گنگا میا کے درشن کریں۔
ہاں، آؤ، ہر کی پاوڑی پر پہنچ کر گنگا میا اپنے سبھی چھوٹے اور بڑے بچوں کو گود میں لے لیتی ہے۔ سبھی بچے جیون کے اُلٹے سیدھے کھیل کھیل کر پاپوں کے میل سے اٹے ہوتے ہیں۔ لیکن میا ممتا سے بے اختیار ہو کر ان کی طرف اپنی باہیں کھول دیتی ہے اور ان کا انگ انگ دھو کر انہیں چھوڑ دیتی ہے ـــــ لو ہر کی پاوڑی آگئی ـــــ دیکھو کتنا بڑا ہجوم ہے!
ہاں، دیکھو ایک ایک کی بات سننے کے لیے میا ہجوم میں ٹھہر گئی ہے۔
نہیں، میا ہر دم چلتی رہتی ہے۔ سب کی سنتی رہتی ہے اور چلتی رہتی ہے ـــــ وہ دیکھو، وہ شخص میا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس سے لگاتار باتیں کیے جا رہا ہے۔
مورکھ ہے۔ رک کر بھی تو میا کو مخاطب کر سکتا ہے۔
ہاں، گنگا میا گزر بھی جائے تو عین وہیں ہوتی ہے جہاں سے گزر گئی ہو۔
ہاں، لیکن گزر ضرور جاتی ہے۔
ہاں، رک جائے تو الٹی بہنا شروع ہو جائے۔

اتنی بہنا شروع ہو جائے تو سوچو، کیا ہو جائے ؟
سوچو، کیا نہ ہو جائے ؟
لیکن شکر ہے گنگا ہمیشہ آگے ہی آگے بہتی رہتی ہے ۔
ہاں، ایک ہی وقت آگے اور پیچھے بہتی ہے ۔
ہاں، ایک ہی وقت ہر جگہ ہوتی ہے ! ـــــ آؤ، آتے جاؤ ۔ وہاں کنارے پر کیوں رک گئے ؟
گنگا نے روک لیا تھا
اچھا ــــــ ! گنگا نے تم سے کیا کہا ؟
کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کسی اور نے دہائی دے کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا ۔
ہائے کتنا اچھا موقع خواہ مخواہ چھن گیا ! ذرا سوچو، گنگا تم سے کیا کہنا چاہ رہی ہوگی ؟
شاید یہ کہ بولو، کیا چاہتے ہو ؟
ہاں، بولو، کیا چاہتے ہو ؟
تمہارے سامنے بولنے سے کیا فائدہ ؟ بھائی سے بھائی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے ؟
ہاں، فائدہ تو ماں سے ہی پہنچتا ہے ۔ سوکھے میں ذرا اور ابھی رہتی ہے کہ بچے نہا دھو کر سیراب ہوتے
رہیں ۔
ہاں، اور برسات میں بھر جاتی ہے تو دونوں پاٹ چیر چیر کر آپ ہی بستیوں میں جا پہنچتی ہے، او
آپ ہی تمہارے پاس آگئی ہوں ۔ مانگو کیا چاہیے ؟
اب کون مانگے، کیا چاہیے، کیا مانگنے والے اور کیا ان کی بستیاں، والہانہ ممتا تو ان کے منہ ہلانے سے
پہلے ہی انہیں بہائے جاتی ہے ۔
ہاں، ممتا والہانہ ہو ہی جاتی ہے ۔ پر والہانہ ممتا سے بھی نقصان پہنچتا ہے ۔ میا آنسو پونچھ پونچھ کر
واپس اپنے پاٹوں میں آجاتی ہے ـــــ آؤ ادھر چلتے ہیں ۔
نہیں یہیں کھڑے رہو، اتنی بھیڑ ہے کہ تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں ۔
ہاں، یہی کیا کم ہے کہ پاپی پاپ بخشوانے چلے آتے ہیں ؟
ہاں، لیکن ہر شخص کے پاپوں کا بھی الگ الگ وجود ہوتا تو سوچو، کتنی بھیڑ ہوتی ۔
ہاں، ایک ایک پاپی ہزار ہزار پاپوں کو جنم دیتا ہے اور ایک ایک پاپ ہزار ہزار اور پاپوں کو ۔
میرا تو اس بھیڑ میں دم نکلا جا رہا ہے ۔
تو نکل جانے دو ۔ ماں کی گود سے بڑھ کے کونسا ایسا استھان ہے جہاں مرنا ہو ۔
لیکن ماں ہمیشہ ہمیں مرنے سے بچا لیتی ہے ۔

ہاں، ماں کی گود میں مرنا بھی ہو تو مرنا نہیں ہوتا۔

ہاں، اسی لیے کہتے ہیں کہ مریں کہیں بھی، پر ہڈیوں کو یہی گنگا میا کی گود نصیب ہو۔

دیکھو وہ بیٹا اپنا سر منڈوا کر باپ کا انتم سنسکار کروا رہا ہے۔ گنگا میا ہڈیوں کی پوٹلی پر اپنی نظر جمائے ہوئے ہے ــــ لاؤ، میری گود میں ڈال دو میں یہ پھول بیدھی بیکنٹھ میں لے جاؤں گی ــــ لاؤ! ــــ

لیکن میرے تو کوئی بیٹا نہیں، میرے پھول یہاں کون لائے گا؟ ــــ

ٹھہرو، گنگا تو بہہ رہی ہے، تم بھی ہاتھ دھو لو اور گنگا سے تیزتر کا وردان مانگ لو ــــ جاؤ، ادھر منہ کر کے جلدی سے وردان لے لو۔ مجھے یقین ہے میا تمہاری یہ نیک خواہش پوری کرے گی۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ ہزاروں لوگ اپنی لاکھوں اِچھائیں لے کے یہاں پہنچے ہوئے ہیں ــــ گنگا، کسی طرح میرا روگ دور کر دے ــــ میری چاروں بیٹیاں بوڑھی ہوتی جا رہی ہیں میا، ان کی ڈولیاں اٹھوانے کے لیے دھن دے! میرا پہلا شوہر مر چکا ہے، اب دوسرا دے گنگا! ــــ مجھے پتر دے گنگا میا ــــ گنگا کس کس کی سنتے، پر سب کی مسکرا مسکرا کر سنتے سر ہلاتے، پلو تھامے تیز تیز چلتی جا رہی ہے ــــ ٹھہر جا میا، میرا بیٹا بڑا لائق ہے۔ اس کی آنکھیں کھول دے یا اسے سچ مچ اندھا کر دے، میرے پاس سب کچھ ہے گنگے، نہیں ہے تو ایک چاند سی بیٹی نہیں! ــــ گنگا اک بیٹا دے دے! ــــ ڈھیروں لوگ ڈھیروں خواہشیں ــــ میری ساتویں خواہش بھی سنتی جاؤ میا! کہتے جاؤ بابا ــــ ساتویں، آٹھویں ــــ سویں! ــــ گنگا سب کی سبھی خواہشیں پوری کر دے گی۔

ہاں گنگا ایک ایک کی ہر ایک خواہش پوری کرنا چاہتی ہے۔

ہاں، لیکن بے چاری کیا کرے؟ ایک ایک کو بیک وقت سن سن کر بوکھلاہٹ سے بڑبڑانے لگی ہے اور اسے ٹھیک طرح یاد نہیں رہا ہے کہ اسے اس کی یہ خواہش پوری کرنی ہے اور اس کی وہ ــــ سو بیوہ کو دوسرے شوہر کی بجائے پتر مل گیا، چار بیٹیوں والے کو ایک اور چاند سی بیٹی مل گئی، روگی کو اور دھن مل گیا ــــ گنگے! ٹھہرو گنگے! ــــ جاؤ بابا، کیوں خواہ مخواہ میا کو پریشان کر رہے ہو؟ ــــ مگر میں نے تو کچھ اور مانگا تھا ــــ ارے جاؤ نا، جو مل گیا ہے اسے تو سنبھالو ــــ

بے چارے سے خفا کیوں ہوتے ہو؟ جو کچھ نہیں ملا، بابا! گنگا وہ بھی دے گی۔ آرام سے جاؤ! ــــ گنگا کے بھنڈارے انت ہیں، اس کا دل بڑا کومل ہے ــــ ہاں مانگو بابا، جو کچھ چاہتے ہو اسے بار بار مانگو! ــــ ارے بھائی، پھر رک گئے؟

گنگا نے روک لیا تھا۔

جلدی بتاؤ، گنگا نے تم سے کیا کہا؟

شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کسی کے پوتے نے اپنے دادا کی ہڈیوں کے پھول اس کی جھولی میں ڈال

الٹی بہنا شروع ہو جائے تو سوچو، کیا ہو جائے؟
سوچو، کیا نہ ہو جائے؟
لیکن شکر ہے گنگا ہمیشہ آگے ہی آگے بہتی رہتی ہے۔
ہاں، ایک ہی وقت آگے اور پیچھے بہتی ہے۔
ہاں، ایک ہی وقت ہر جگہ ہوتی ہے! ــــ آؤ، آتے جاؤ۔ وہاں کنارے پر کیوں رک گئے؟
گنگا نے روک لیا تھا
اچھا ــــ! گنگا نے تم سے کیا کہا؟
کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کسی اور نے دہائی دے کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔
ہائے کتنا اچھا موقع خواہ مخواہ چھن گیا! ذرا سوچو، گنگا تم سے کیا کہنا چاہ رہی ہوگی؟
شاید یہ، کہ بولو، کیا چاہتے ہو؟
ہاں، بولو، کیا چاہتے ہو؟
تمہارے سامنے بولنے سے کیا فائدہ؟ بھائی سے بھائی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
ہاں، فائدہ تو ماں سے ہی پہنچتا ہے۔ سوکھے میں ذرا اور ابہتی رہتی ہے کہ بچے نہا دھو کر سیراب ہوتے رہیں۔
ہاں، اور برسات میں بھر جاتی ہے تو دونوں پاٹ چیر چیر کر آپ ہی بستیوں میں جا پہنچتی ہے، لو میں آپ ہی تمہارے پاس آگئی ہوں۔ مانگو کیا چاہیے؟
اب کون مانگے، کیا چاہیے۔ کیا مانگنے والے اور کیا ان کی بستیاں، والہانہ ممتا توان کے منہ ہلانے سے پہلے ہی انہیں بہائے جاتی ہے۔
ہاں، ممتا والہانہ ہو ہی جاتی ہے۔ پر والہانہ ممتا سے بھی نقصان پہنچتا ہے۔ میا آنسو پونچھ پونچھ کر واپس اپنے پاٹوں میں آجاتی ہے ــــ آؤ ادھر چلتے ہیں۔
نہیں، یہیں کھڑے رہو، اتنی بھیڑ ہے کہ تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں:
ہاں، یہی کیا کم ہے کہ پاپی پاپ بخشوانے چلے آتے ہیں؟
ہاں، لیکن ہر شخص کے پاپوں کا بھی الگ الگ وجود ہوتا تو سوچو، کتنی بھیڑ ہوتی۔
ہاں، ایک ایک پاپی ہزار ہزار پاپوں کو جنم دیتا ہے اور ایک ایک پاپ ہزار ہزار اور پاپوں کو۔
میرا تو اس بھیڑ میں دم نکلا جا رہا ہے۔
تو نکل جانے دو۔ ماں کی گود سے بڑھ کے کونسا یوگیہ استھان ہے جہاں مرنا ہو۔
لیکن ماں ہمیشہ ہمیں مرنے سے بچا لیتی ہے۔

دیے اور وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔
تمہارے تو کوئی بیٹا ہی نہیں ہے، کوئی پوتا کیونکر تمہارے پھول یہاں لائے گا؟ ـــــ جاؤ ادھر منہ کر کے جلدی سے میا سے ایک بیٹا مانگ لو۔
لیکن میرے بیٹے کی ہڈیاں مجھ سے پہلے ہی پھول ہو گئیں تو؟ ـــــ
تو دو بیٹے مانگ لو۔
نہیں، ایک ہی کافی ہے۔
"ہاں، ایک ہی سو برس کی عمر کا ہو تو کافی ہے۔
نہیں۔ تمہارے تو ایک بھی نہ ہو تو ہرج نہیں۔ تمھیں تو ایک ہزار برس جئے جانا ہے۔
ایک ہزار برس؟
ایک ہزار برس نہیں، تو جگہ جگہ اتنے پکے مکان کیوں بنواتے جا رہے ہو؟
ارے بھئی۔ میں نے تو یہاں بھی گنگا کے کنارے زمین کا ایک ٹکڑا خرید لیا ہے۔ اتنی پیاری عمارت بنواؤں گا کہ گنگا میا دن رات اس کا سایہ اپنے کلیجے میں جھلایا کرے گی۔
یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ تمہارا مکان بن جائے تو ہم دونوں سب کچھ تج کر یہاں زندگی کے کنارے مہینوں سستانے کے لیے آیا کریں گے۔
لیکن زندگی کے اس آخری کنارے پر پہنچ کر ہم پیچھے کیسے جائیں گے؟
ہاں، آخری کنارے پر پہنچ کر تو آگے ہی جانا ہوتا ہے ـــــ پر یہاں تک تو دھرتی عرصے چلے آئے، اب یہاں سے آگے تمہارا گھوڑا سکے کیونکر چلے گا؟
ہاں، اب آگے کی بود و باش کے لیے سجا سکو تو یہیں یہیں کمانا ہے۔ آئندہ میں یہاں آؤں گا تو یہاں سے کبھی نہ جاؤں گا۔
آئندہ؟
ہاں، آئندہ۔ اپنا سارا لین دین چکا کے، سب کچھ لے کے یہیں چلا آؤں گا۔
پر جو کچھ یہاں لاؤ گے اسے یہاں سے آگے کیسے لے جاؤ گے؟
جو کچھ یہاں لاؤں گا اسے یہیں لگا دوں گا۔
تم بڑے کاروباری آدمی ہو پر گنگا کی باتیں صرف گنگا ہی جانتی ہے۔ جاؤ پہلے اس سے پوچھ تو لو۔
ہاں، واقعی پہلے اس سے پوچھ تو لوں۔ اک ذرا ابھی پوچھ لیں تو گنگا آگے بڑھ کے آپ ہی بتاتی ہے کہ اس کے پانی میں قدم کیسے دھرنا ہے۔
ہاں، آپ ہی بتاتی ہے کہ پانی کہاں گہرا ہے ـــــ جاؤ، گنگا یہاں ساری کی ساری موجود ہے اور بڑے

اطمینان سے اپنی سطح پر بہہ رہی ہے۔ جاؤ، آگے بڑھ کے پوچھ لو۔

ہاں، پوچھ کے آتا ہوں۔ یہیں ٹھہرو۔

فکر مت کرو۔ مجھ جیسے لوگ انتظار کیے جانے کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں! —— تم جا بھی چکے ہو مگر میں عادتاً تمہیں مشورہ دیے جا رہا ہوں کہ تامل سے کام نہ لو بڑھے چلے جاؤ۔ زندگی کو میں اپنی واردات نہیں بنا پاتا ہوں، بس اوروں کی واردات کا انتظار کیے جاتا ہوں ——

—— ارے، تم تو آ بھی گئے ہو۔

ہاں، آتو گیا ہوں لیکن پھر شاید جانا نہ ہو۔

کیوں، گنگا نے تم سے کیا کہا! —— تم نے اس سے اپنے لیے بیٹا مانگا؟"

ہاں۔

تو پھر گنگا نے تم سے کیا کہا؟

گنگا نے میری ساری بات سن کر صرف یہ کہا۔ اپنی ہڈیاں آپ ہی لے کے آ گئے ہو تو اب آپ ہی انھیں یہاں ڈال دو۔

دیے اور وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔
تمہارے تو کوئی بیٹا ہی نہیں ہے، کوئی پوتا کیونکر تمہارے پھول یہاں لائے گا؟ ـــــ جاؤ ادھر منہ کر کے جلدی سے میا سے ایک بیٹا مانگ لو۔
لیکن میرے بیٹے کی ہڈیاں مجھ سے پہلے ہی پھول ہوگئیں تو؟ ـــــ
تو دو بیٹے مانگ لو۔
نہیں، ایک ہی کافی ہے۔
"ہاں، ایک ہی سو برس کی عمر کا ہو تو کافی ہے۔
نہیں۔ تمہارے تو ایک بھی نہ ہو تو ہرج نہیں۔ تمھیں تو ایک ہزار برس جئے جانا ہے۔
ایک ہزار برس؟
ایک ہزار برس نہیں، تو جگہ جگہ اتنے کے مکان کیوں بنواتے جا رہے ہو؟
ارے بھئی۔ میں نے تو یہاں بھی گنگا کے کنارے زمین کا ایک ٹکڑا خرید لیا ہے۔ اتنی پیاری عمارت بنواؤں گا کہ گنگا میا دن رات اس کا سایہ اپنے کلیجے میں جھیلا کرے گی۔
یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ تمہارا مکان بن جائے تو ہم دونوں سب کچھ تج کر یہاں زندگی کے کنارے مہینوں بسنے کے لیے آیا کریں گے۔
لیکن زندگی کے اس آخری کنارے پر پہنچ کر ہم پیچھے کیسے جائیں گے؟
ہاں، آخری کنارے پر پہنچ کر تو آگے ہی جانا ہوتا ہے ـــــ پر یہاں تک تو دھرتی خریدتے چلے آئے، اب یہاں سے آگے تمہارا کھوٹا سکہ کیونکر چلے گا؟
ہاں، اب آگے کی بود و باش کے لیے سچا سکہ تو یہیں کمانا ہے۔ آئندہ میں یہاں آؤں گا تو یہاں سے کبھی نہ جاؤں گا۔
آئندہ؟
ہاں، آئندہ۔ اپنا سارا لین دین چکا کے، سب کچھ لے کے یہیں چلا آؤں گا۔
پر جو کچھ یہاں لاؤ گے اسے یہاں سے آگے کیسے لے جاؤ گے؟
جو کچھ یہاں لاؤں گا اسے یہیں لگا دوں گا۔
تم بڑے کاروباری آدمی ہو پر گنگا کی باتیں صرف گنگا ہی جانتی ہے۔ جاؤ پہلے اس سے پوچھ تو لو۔
ہاں، واقعی پہلے اس سے پوچھ تو لوں۔ اک ذرا بھی پوچھ لیں تو گنگا آگے بڑھ کے آپ ہی بتاتی ہے کہ اس کے پانی میں قدم کیسے دھرنا ہے۔
ہاں، آپ ہی بتاتی ہے کہ پانی کہاں گہرا ہے ـــــ جاؤ، گنگا یہاں ساری کی ساری موجود ہے اور بڑے

اطمینان سے اپنی سطح پر بہہ رہی ہے۔ جاؤ، آگے بڑھ کے پوچھ لو۔
ہاں، پوچھ کے آتا ہوں۔ یہیں ٹھہرو۔
فکرمت کرو۔ مجھ جیسے لوگ انتظار کیے جانے کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں! ــــــ تم جا بھی چکے ہو مگر میں عادتاً تمہیں مشورہ دیے جا رہا ہوں کہ تال سے کام نہ لو بے چلے جاؤ۔ زندگی کو میں اپنی واردات نہیں بنا پاتا ہوں، بس اوروں کی واردات کا انتظار کیے جاتا ہوں ــــــ
ــــــ ارے، تم تو آ بھی گئے ہو۔
ہاں، آ تو گیا ہوں لیکن پھر شاید جانا نہ ہو۔
کیوں، گنگا نے تم سے کیا کہا! ــــــ تم نے اس سے اپنے لیے بیٹا مانگا؟"
ہاں۔
تو پھر گنگا نے تم سے کیا کہا؟
گنگا نے میری ساری بات سن کر صرف یہ کہا۔ اپنی ہڈیاں آپ ہی لے کے آگئے ہو تو اب آپ ہی انھیں یہاں ڈال دو۔

نَازَائیدَہ

راناپیلس کے بار میں چند دوست بیٹھے شراب پی رہے تھے اور متعجب تھے کہ دو بڑے بڑے ٹاٹ حلق سے اتار لینے کے باوجود نشے کا احساس کیوں نہیں ہو رہا ہے۔

"ایک تو یہ ہو سکتا ہے" سمپت کہنے لگا "کہ سالی شراب ہی اچھی نہ ہو"

"مگر شراب کی بوتل پر مہر وغیرہ تو میں نے چیک کر لی تھی" رام سنگھ نے اسے بتایا۔

"مہر کو چھوڑو یار" جمال نے کہا "نوکری اور بیوی ملنے سے پہلے مہر تو میری بھی بڑی سختی سے چیک کی گئی مگر مجھے معلوم ہے کہ میں اچھا آدمی نہیں ہوں"

"تو دوستو، نتیجہ یہ نکلا کہ شراب تو اچھی ہے، شاید ہم ہی برے ہیں"

"شاید کیوں! مجھے تو یقین ہے کہ میں ہی برا ہوں"

رام سنگھ سب کے لیے ایک ایک اور تگڑا سا ٹاٹ بنانے لگا۔

"نہیں، اگر تم واقعی برے ہو مہربان سنگھ، تو اب تک تم پر شراب کا بڑا اچھا نشہ طاری ہو جانا چاہیے تھا ــــ میرے گلاس میں تھوڑی اور ڈال دو رام سنگھ" سمپت نے اپنا گلاس رام سنگھ کی طرف سرکا کر کہا ــــ "میرا تو یہ خیال ہے کہ ہم اچھے ہیں نہ برے، بس جیسے ہیں ویسے ہی ہیں، ورنہ نشہ نہیں چڑھا تو ہم کم سے کم ہوش میں تو ہوتے"

"میں تو پورے ہوش میں ہوں" رام سنگھ سمپت کے گلاس میں شراب انڈیلنے لگا۔

"پورے ہوش میں ہیں؟ ــــ ہہ ہہ ہا ــــ ہہ! ــــ ہہ! ــــ"

مہربان سنگھ نے قہقہہ لگایا: واہ بھائی جی، واہ ـــــ تم ہی ایک خوش نصیب ہو رام سنگھ، سب سے آج نشہ چڑھا ہے۔"

"ہاں بھئی، آج کل تو ہمارا خدا بھی پورے ہوش میں نہیں۔ جو شخص بھی دنیا میں بھیج رہا ہے، ہم جیسا ـــــ چند لوگ اچھے ہوں چند بُرے، کوئی گھمسان کا یدھ ہو اور جینے دینے کا ذرا مزہ آئے ـــــ"

"ہاں" رام سنگھ انھیں سمجھانے لگا۔ "اسی لیے میں اپنے آپ سے جو بیس گھنٹے لڑتا رہتا ہوں، اپنی آتی پٹائی کرتا ہوں پر مجال ہے ایک خراش بھی آجائے۔"

"نہ بابا، مجھے تو مار کٹائی سے ڈر لگتا ہے۔ میرا خون اتنا میٹھا ہے کہ ذرا بھی زخم آجائے تو بھرنے کا نام نہ لے۔"

تم ٹھیک کہتے ہو مہربانے، ہم لوگوں کی سوچ کو بھی ذیابیطس ہو گیا ہے۔ تھوڑا سا غصہ آ بھی جاتا ہے تو ہم زخم کے ڈر سے ہنسنے لگتے ہیں ـــــ یار کوئی مزیدار جوک سناؤ رام سنگھ۔"

"وہ تو اپنا جوک سنا چکا ہے کہ پورے ہوش میں ہے۔"

"سمپت، میرے بھائی" مہربان نے کہا۔ "میری آنکھوں میں سگریٹ کا دھواں کیوں چھوڑ رہے ہو؟"

"تاکہ چبھن سے تمہاری آنکھوں سے گندا پانی اُتر جائے مہربانے، اور تم صاف صاف دیکھنے لگو۔"

"صاف صاف دیکھنے سے بھی کون سا دانگورہ نظر آجائے گا یارو" مہربان سنگھ اپنی آنکھیں ملنے لگا۔

"لاؤ رام سنگھ، تھوڑی اور ڈالو۔ اپنے سردار بھائی ہو پر ہر بار دوسروں سے کم ڈال جاتے ہو"

"ہاں، سردار بھائی۔ میں بڑا کمینہ آدمی ہوں۔ کسی سالے کو اپنا سمجھ کر فائدہ پہنچانا چاہتا ہوں تو بے چارے کو مجھ سے اُلٹا نقصان پہنچ جاتا ہے۔"

"لو، مہربان" سمپت نے سگریٹ سلگا کر پیش کش کی۔ "اس سے پہلے میں اپنا خیال بدل لوں، میری حماقت کا فائدہ اٹھاؤ اور اس راؤنڈ کا میرا یہ بقیہ حصہ بھی پی جاؤ ـــــ جلدی کرو بھائی! ـــــ"

"کوئی نیکی کرنے کا خیال آتے ہی ہم اپنے آپ کو احمق کیوں سمجھنے لگتے ہیں؟" جمال نے منہ اتنا معصوم بنا لیا کہ سمپت کا جی چاہا، اسے ڈانٹ دے، چپ! بڑوں کی باتوں میں بچے نہیں بولتے۔

"بتاؤ نا، کوئی نیکی کرنے کا ـــــ"

"ارے بتائیں کیا؟" سمپت نے اسے ٹوکا۔ "نیکیاں کرنا صرف نیک آدمیوں کا کام ہے۔ ہمیں اوپر والا کوئی اسپیشل الاؤنس تھوڑا ہی دیتا ہے جو اپنا کام بڑھاتے چلے جائیں۔"

"اس میں بے چارے اوپر والے کا کیا دوش؟ وہ تو اوپر کے چند لوگ ہی اس کی ساری نعمتوں کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔" جمال کو سر کھجانے کی خواہش ہو رہی تھی لیکن اپنی ٹوپی اتار کر اسے سر کھجانا یاد نہ رہا۔

"اور باقیوں کو جیتے جی جہنم میں ہانک دیتے ہیں۔"

"میرا دا انگور تو میری سنے گا نہیں، جمال" مہربان سنگھ نے کہا: "پر تم اتنے برے نہیں ہو۔ کبھی فرصت میں اپنے خدا کو ساری باتیں کھول کر سمجھا آؤ۔"

سمپت ہنسنے لگا: "سالی شراب ہی جب بے اثر ہے تو خدا سے باتیں کرنا کیونکر ہو گا! ——— بوائے اور بھجیا لاؤ! ———"

"بھجیا سے ہی پیٹ بھر لو گے سمپت، تو شراب کہاں ڈالو گے؟"

"سر میں، رام سنگھ! میں پیتا ہوں تو صرف اس لیے، کہ اپنا سر شراب میں ڈبو دوں اور میری ساری سوچیں مردہ ہو کر سطح پر ابھر آئیں ———"

جمال کو اچانک سر کھجانا یاد آگیا اور وہ ٹوپی پہلو میں ڈال کر سر کھجانے لگا۔ مگر اب کے اسے وہ بات بھول گئی جسے کہنے کے لیے اس نے منہ کھولا تھا۔

"میں بھی جب خوب پی لیتا ہوں دوستو،" مہربان سنگھ انھیں بتانے لگا: "تو میری سوچوں کے لاشے ابھر ابھر کر اندرونی کھوپڑی کو چھونے لگتے ہیں اور میں بے چین ہو کر اپنے سر کو اور زور سے کھجانے لگتا ہوں۔ اور مردہ سوچیں جوؤں کی جون میں زندہ ہو ہو کر جھڑنے لگتی ہیں ———"

"تمھیں زندہ یا مردہ سوچوں سے کیا غرض، مہربان سنگھ؟" جمال کو سر کھجا کر چین آگیا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمھاری جوئیں ہی جوؤں کی جون لے کر جھڑتی ہوں گی۔"

گرم گرم بھجیا آگیا تو چاروں نے بیک وقت پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔

"شراب کے ساتھ ہمیں اچھی خوراک کھانی چاہیے۔" رام سنگھ نے منہ کو بھجیا سے ٹھونس کر بھر لیا۔

"بھجیا میں رکھا ہی کیا ہے؟"

"صرف بھجیا!"

"ہاں بھجیا میں کباب کہاں سے آجائیں گے؟ ——— بوائے کباب کی بھی ایک پلیٹ لے آؤ!"

"پر تم تو گوشت خور نہیں ہو سمپت؟"

"جب سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ گھاس پھوس میں بھی جان ہوتی ہے میں نے ہر جاندار کا گوشت کھانا شروع کر دیا ہے۔"

"انسان کا بھی سمپت!"

انسان کا بھی کھا لیتا لیکن مجھے گوشت کی جگہ پلاسٹک کھانا پسند نہیں! ——— ارے سنو۔ باہر مارکیٹ میں شور کیوں ہو رہا ہے؟ ———"

سینکڑوں قہقہے باہر سے سرپٹ دوڑتے ہوئے ان کے کانوں میں گھس گھس کر ناک یا منہ یا آنکھوں

ہیں تیز تیز پھدکنے لگے۔

• آؤ، باہر جاکے دیکھتے ہیں ۔

چاروں باہر آگئے اور دیکھا کہ ان گنت لوگ مارکیٹ کے فرسٹ فلور کے جنگلے پر جھکے بے تحاشہ ہنستے ہوئے گراؤنڈ فلور کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

سپت سب کے آگے آگے جنگلے کی طرف ہولیا۔ وہ اس قدر احتیاط سے چل رہا تھا کہ صاف پیے ہوئے معلوم ہوتا تھا ـــــ ارے! ـــــ اچانک وہ کسی سے ٹکرا گیا اور اس بھلے مانس کو ہدایت کرنے لگا کہ شراب پی کر گاڑی چلانا منع ہے وہ ہنسنے لگا تو یہ بولا "ارے بھائی، ہنسنے کی کیا بات ہے؟ گاڑی ہی تو چلاتے ہو ـــــ نشے میں ٹوٹ پھوٹ گئی تو ساری عمر بھک بھک کرتے بیتے گی۔ ارے بھائی رام سنگھ " اس نے اچانک اپنا منہ رام سنگھ کی طرف موڑ لیا۔

• وسکی کی بوتل وہاں میز پر ویسے ہی چھوڑ آئے ہو، کوئی بیرا اوپرا منہ لگا کے اتنی ہی پانی سے بھر دیگا۔

• ہاں ۔ مہربان بولا ۔ میں کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ کے ساتھ ہی لے آتا ہوں ۔ جنگلے کے آس پاس بھیڑ کو چیر کر وہ بھی نیچے دیکھنے لگے۔

• کہاں ہے؟ •

• کیا ہے؟ کون ہے؟ ـــ! •

• وہ ـــ وہ دیکھو! ـــ •

انھوں نے دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔

ایک نوجوان عورت اپنے گھاگرے کو ہاتھوں سے اوپر اٹھا کے ایک دکان کے سامنے ننگی کھڑی تھی۔ گراؤنڈ فلور پر بھی کئی آدمی اس کے اردگرد جمع ہو کر جپے جا رہے تھے۔ ان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں، اعصاب تنے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے کو جھٹک جھٹک کر گویا بڑے دھیان سے دیکھنے کو کہہ رہے تھے۔

• او بھوری ـــ!"

• اری بھوری، ادھر بھی تو دیکھو! ـــ •

• لو، دیکھ لو! ۔ بھوری بولنے والوں کی طرف ناچنے کے انداز میں مڑ مڑ کر ویسی ہی ننگی کھڑی رہی

• لاؤ، کیا دوگے؟

• ادھر بھی، بھوری! • کسی نے اس کی طرف دو کا نوٹ پھینک کر خواہش ظاہر کی ۔ اور بھوری نے ہنستے ناچتے نوٹ اٹھا کر اس کی طرف منہ کر لیا: لو! •

اس کے سامنے کی دکان والے نے اس سے ہاتھ جوڑ کر کہا: جاؤ بھوری، بھگوان کے لیے جان چھوڑ دو۔

بھوری نے اپنا گھاگرا کندھوں تک اوپر اٹھا کے گلے میں لپیٹ لیا اور دکاندار کی طرف سر اٹھا کر مسکرائی۔

"پہلے پانچ روپے دو، پھر چھوڑوں گی"

"پولیس! — پو — ! —"

بھوری نے دھڑاپ سے گھاگرا نیچے گرا لیا اور مڑ کر دیکھنے لگی مگر یہ اطمینان کر کے کہ کسی نے یونہی مذاق اڑایا ہے، گھاگرے کو پھر اوپر اٹھا لیا اور لوگوں نے پھر اپنی نظریں اس کی رانوں میں ٹھونس لیں۔

دکاندار نے بڑبڑاتے ہوئے روپے روپے کے دو تین سکے اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا "جاؤ سوری ماں، بھاگو اب —!"

"ڈٹی رہو بھوری، ڈرو نہیں"

"لاؤ" بھوری نے بولنے والے کی طرف مڑ کر کہا

لو! — لو! — لو! — ل —! —

یکبارگی کئی تماشائی اس پر چاروں طرف سے چھوٹے موٹے سکے پھینکنے لگے۔

"ارے! — ارے! میری جان کے بیری کیوں ہو گئے ہو؟" بھوری اپنے وجود کو گھما گھما کر بولی۔ "کنکر کیوں مار رہے ہو؟ نوٹ اور نجر بیں مارو"

"سمپت! — سم — " سمپت جنگلے پر جھکے جھکے نیچے لڑھک جانے کو تھا کہ جمال نے اسے تھام لیا۔ "اس بھوری بھینس کے پاس پہنچنا ہے تو اُدھر سیڑھیوں سے نیچے جاؤ۔ یہ راستہ تو سیدھا جہنم کو جاتا ہے۔"

"تو کیا ہوا، میرے یار! تم بھی تو میرے ساتھ ہو گے —"

"رام سنگھے، تمہاری پتلون کوئی گھاگرا تو نہیں جو تم بھی اسے بار بار اوپر اٹھا رہے ہو"

"نہیں، مہربان، بات یہ ہے کہ وہ اپنا گھاگرا اوپر اٹھاتی ہے تو مجھے لگتا ہے میری پتلون نیچے سرک رہی ہے۔"

"سرکنے دو، سنگھے، — پر کیا فائدہ؟ پتلون کے نیچے تم نے اپنا کچھا صاحب پہن رکھا ہو گا"

اسی اثنا میں اوپری منزل سے دو تین دکاندار بھوری کو وہاں سے ہٹانے کے لیے اس پر پانی کی بالٹیاں انڈیلنے لگے اور وہ سرعت سے گھاگرے کو ٹانگوں پر گرا کے چیختی ہوئی مارکیٹ کے باہری گیٹ کی طرف بھاگنے لگی اور اس کے پیچھے پیچھے ساری بھیڑ۔

"بھوری تو گئی لیکن چلو، ہماری بھوری بوتل تو موجود ہے۔"

"تمھاری بھوری کس کام کی ہے رام سنگھ —— دیکھو نا، جو بھوری نٹ آور تھی، اس کا کاک آپ ہی آپ بھپ سے کھل گیا —— وہ آپ ہی آپ سے منہ سے آلگی اور اس سے پہلے کہ لوگ اسے غٹ غٹ پی جائیں، وہ آپ ہی آپ پھر سے اڑ گئی ——" سمپت اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ "بڑی خاص چیز تھی۔"

"وہ تو گئی بابا، پر جو ہے، جیسی بھی ہے، اسے کیوں چھوڑتے ہو! —— آؤ۔"

"چلو!" سمپت چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ "سالی اتنی آبدار تھی کہ اس کے جانے کے بعد بھی یہی لگ رہا ہے اسے گھونٹ گھونٹ پیے جا رہے ہیں۔" اس نے پھر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"جو چیز ہاتھ سے نکل جائے سمپت،" یہ جمال اسے سمجھانے لگا، "اسے بھول جانے میں ہی بھلائی ہوتی ہے۔"

"کیا اسے بھول کر آپ اپنا بھلا کر چکے ہیں مولوی صاحب!"

"نہیں، مجھے تمہارا بھلا کرنا مقصود تھا۔ میرا تو یہ ہے کہ جو بھی بری خواہش میرے بس سے باہر ہوتی ہے اسے پورا کرنے کے لیے کوئی ایسی بری خواہش پوری کر لیتا ہوں جو میرے بس میں ہو۔"

"تو وہاں اس پیشاب گاہ میں اپنی خواہش پوری کر کے ہمارے پیچھے چلے آؤ —— آؤ سمپت۔"

"نہیں، ٹھہرو۔" سمپت نے چاروں طرف نظر دوڑا کر کہا۔ "ابھی ابھی یہاں میلا لگا ہوا تھا مگر اتنی سی دیر میں ہی اب کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔"

"دکھائی کیسے دے؟ وہ سبھی کو اپنے گھاگرے میں سمیٹ کر لے گئی ہے۔"

"ہہ ہہ ہا —— ہہ —— ہا!" سمپت اپنے شرابی قہقہے سے گدگدی محسوس کر کے اور زور سے قہقہانے لگا۔ "ہہ ہہ —— ہا! —— سبھی حرامی پلے بڑے آرام سے اپنی ماں کے گھاگرے میں جا سمٹے ہیں کہ شاید اسی طرح پیدا ہو جائیں گے۔ پر ان سے پوچھو، وہ بانجھ انہیں جنے گی کیسے؟ —— ہہ ہا ہہ ہا!"

ایک جاسوسی کہانی

بابر نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا سامان وہیں اسٹیشن ماسٹر کی نگرانی میں چھوڑ کر پیدل ہی اپنے گاؤں کو ہو لے۔ چاندنی رات ہے اور زیادہ سے زیادہ ڈھائی میل کا فاصلہ ہے ـــــ چلو! ـــ اس نے اپنے آپ کو حکم دیا اور مسکرانے لگا ـــــ ارے بھائی ریٹائر ہو کے آرہے ہو۔ اب بھی حکم وکم چلاتے رہو گے تو اوروں کو چھوڑو، اپنا کہنا خود آپ بھی نہ مانو گے۔

اسٹیشن ماسٹر سے مل کر وہ ریلوے پلیٹ فارم سے باہر آگیا اور اُس کی آنکھوں سے برآمد ہو کر اس کے سامنے ایک سڑک دور دور تک سیدھی بچھتی چلی گئی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر برگد کے درخت داڑھیاں لٹکائے چپ چاپ گویا ہتھیار ڈال کر نہتے کھڑے تھے۔

خبردار! فرار ہونے کی کوشش کی تو گاڑ کے رکھ دوں گا۔

بابر کے نام سے بڑے بڑے ڈاکو کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔

نہیں، کانوں تک نہیں، ایک دم سیدھے اوپر اٹھاؤ۔

برگد کا وہ درخت تو نرا پرا رام سنگھ دکھائی دے رہا تھا۔ بابر کی آنکھوں کی دونالی بندوق کے سامنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے! ـــــ

بابر ہنسنے لگا۔ جب تک آزاد تھا چاروں طرف دھاندلی مچائے ہوئے تھا، پر اب گر گیا ہے تو ڈاڑھی کھول کے فقیر بن گیا ہے ـــــ نہیں ـــــ بابر نے ذرا سنجیدہ ہو کر اپنے آپ سے اتفاق کرنے سے انکار کر دیا ـــــ رام سنگھ طوفانی ضرور تھا لیکن شروع سے ہی دل کا گہرا اور گرا ہوا فقیر تھا۔

وہ سڑک پر اُتر آیا اور اس کے قدم تیز تیز اپنی حویلی کی طرف اُٹھنے لگے ـــ میں نے اچھا ہی کیا کہ اطلاع دیے بغیر چلا آیا ہوں، لتّو کو ہمیشہ شکایت رہتی ہے کہ میں اطلاع کے بغیر اچانک غائب ہو جاتا ہوں ـــ اور اطلاع کے بغیر آجاتا ہوں، تب ؟ ـــ تب بھی یہی لگتا ہے کہ کسی ڈاکو کی قید سے ایک آدھ گھنٹے کی مہلت لے کے آئے ہو ـــ چلو اچھا ہوا، اس دھندے سے چھٹکارا ہو گیا ہے۔ اب مزے سے ساری عمر اپنے گاؤں کی حویلی میں گزار دیں گے، جو من میں آیا کریں گے ـــ پر جو کچھ بھی کرنا ہے وہ تو تم کر چکے ہو بابر۔ نہیں، ابھی نہیں، بڑے بڑے ڈاکے ڈالنے ہیں لتّو، اور پھر اکٹھا سولی پر چڑھنا ہے ـــ تو ٹھیک ہے میرے ڈاکو، میں ابھی جا کے تمہارے غار کی جھاڑ پھونک کرتی ہوں ـــ ابھی ؟ ـــ اور کیا ؟ اتنی بڑی حویلی ہے، دو چار ماہ بھی پہلے گاؤں نہ گئی تو کیا ہم چمگادڑ رہیں گے وہاں چین سے الٹا لٹک کر گزار دیں گے ؟ تم اپنی ریٹائرمنٹ پر چلے آنا، میں ابھی جا کے حویلی کو رہنے کے قابل بناتی ہوں ـــ تو پھر مجھے کون اس قابل بنائے گا کہ میں تمہاری حویلی میں رہ سکوں ! ـــ وہاں پہنچ لو، پھر دیکھو کیسے اس قابل بناتی ہوں ـــ

بابر سوچ رہا تھا کہ چوکیدار کو سمجھا کر باہر حویلی کے گیٹ پر ہی روک دوں گا اور دبے پاؤں لتّو کی خواب گاہ کی طرف ہو لوں گا اور پھر روشندان سے دروازے کی اندرونی چٹخنی کھول کر چپکے سے اس کے ساتھ جا پڑوں گا۔ لتّو اس عمر میں بھی کھلی آنکھوں سے سپنے دیکھنے کی عادی ہے۔ جاگ بھی پڑی تو خواب میں ڈوبی پڑی رہے گی اور جب خواب سے اوپر ابھرے گی تو مجھے سچ مچ وہاں پا کر خوشی سے کانپتی ہوئی گلے سے چمٹ جائے گی ـــ ڈاکو ! ـــ ڈاکو ! ـــ اُسے اپنا ڈی، ایس، پی شوہر اس لیے محبوب تھا کہ اُسے ڈاکو سا لگتا تھا۔

بابر کسی آٹو موبیل کے مانند اسپیڈ میں اڑا جا رہا تھا کہ اُسے بے چین سا احساس ہونے لگا کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ دراصل جس دن سے وہ اپنی پوسٹ سے ریٹائر ہوا تھا اسے کئی بار محسوس ہو چکا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے وہ بزدل نہ تھا اور پیشے کی تربیت اور ضبط کے باعث اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ سامنے سے دس آدمی بھی ٹوٹ پڑیں تو وہ ان کے مقابلے میں ڈٹ جائے، لیکن کوئی آگے ہو نہ پیچھے، بس کہیں چھپ کر ہر لحظ آپ کی ٹوہ میں ہو، اس حالت میں آپ پر گو مگو اور ڈر کی کیفیت طاری ہوئی جاتی ہے۔ بابر نے اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بدستور آگے بڑھتے رہنا چاہا، پر وہ برگد کا درخت ڈاڑھی ہلا ہلا کر اس پر ہنسنے لگا ـــ بابر، اپنے پیچھے دیکھنے سے کیوں گھبرا رہے ہو؟ ـــ دیکھو ! ـــ وہ دیکھو، کون آرہا ہے ؟ ـــ بابر نے تیزی سے اپنا سر موڑ لیا۔ پیچھے کوئی بھی نہیں آرہا تھا ـــ نہیں، وہ ـــ وہاں تھوڑے فاصلے پر ـــ نہیں ! وہ تو کتا ہے۔ کتنا اچھل اچھل کر چاندنی میں پھنسے ہوئے اپنے ہی سائے سے لڑ رہا تھا، یا شاید کھیل رہا تھا، بابر کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر وہ رک گیا اور اس کی طرف سر اٹھا کر شاید سوچنے لگا کہ بھونکنا شروع کر دے یا اُسے جانے دے۔ بابر نے اُسے پچکار کر اپنے پاس بلانا چاہا جس سے کتے کو غصہ آ گیا اور وہ بے اختیار بھونکنے لگا۔ اس کے بھونکنے کی آواز سن کر بابر چونک پڑا ـــ یہ تو ـــ یہ تو غفار کے کتے کی آواز ہے۔ غفار ایک نہایت جابر مجرم تھا۔ ایک بار بابر

ایکُ جَاسُوسِی کہانی

بابر نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا سامان وہیں اسٹیشن ماسٹر کی نگرانی میں چھوڑ کر پیدل ہی اپنے گاؤں کو ہولے۔ چاندنی رات ہے اور زیادہ سے زیادہ ڈھائی میل کا فاصلہ ہے ــــ چلو! ــ اس نے اپنے آپ کو حکم دیا اور مسکرانے لگا ــــ ارے بھائی ریٹائر ہو کے آ رہے ہو۔ اب بھی حکم و کم چلاتے رہو گے تو اوروں کو چھوڑو، اپنا کہنا خود آپ بھی نہ مانو گے۔

اسٹیشن ماسٹر سے مل کر وہ ریلوے پلیٹ فارم سے باہر آگیا اور اُس کی آنکھوں سے برآمد ہو کر اس کے سامنے ایک سڑک دور دور تک سیدھی بچھتی چلی گئی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر برگد کے درخت داڑھیاں لٹکائے چپ چاپ گویا ہتھیار ڈال کر نہتے کھڑے تھے۔

خبردار! فرار ہونے کی کوشش کی تو گاڑ کے رکھ دوں گا۔

بابر کے نام سے بڑے بڑے ڈاکو کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔

نہیں، کانوں تک نہیں، ایک دم سیدھے اوپر اٹھاؤ۔

برگد کا وہ درخت تو نرا بڑا رام سنگھ دکھائی دے رہا تھا۔ بابر کی آنکھوں کی دونالی بندوق کے سامنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے! ــــ

بابر ہنسنے لگا۔ جب تک آزاد تھا چاروں طرف دھاندلی مچائے ہوئے تھا، پر اب گرڈ گیا ہے تو داڑھی کھول کے فقیر بن گیا ہے ــــ نہیں ــــ بابر نے ذرا سنجیدہ ہو کر اپنے آپ سے اتفاق کرنے سے انکار کر دیا ــــ رام سنگھ طوفانی ضرور تھا لیکن شروع سے ہی دل کا گہرا اور گرا ہوا فقیر تھا۔

نے اُسے اپنی پناہ گاہ میں جالیا تو کہیں سے یہی کتا ـــــ ارے ہاں، یہی تو تھا ـــــــــــــــــ
اُسے کاٹ کھانے کے لیے کود پڑا ـــ اور ـــ اور بابر نے اسے شوٹ کر کے وہیں ٹھنڈا کر دیا ـــ یہ کتا ـــ یہ ـ
یہ تو ـــ بابر نے بڑے غور سے دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ کتا دراصل چپ چاپ کھڑا ہے اور اس کا اتنا بڑا سایہ چاندنی
میں سے اچھل اچھل کر بھونک رہا ہے ـــ ایسے کیسے؟ ـــ نہیں، سایہ بھی خاموش تھا ـــــ اور کتا بھی ـ لیکن اس
کے کانوں میں بھونکنے کی صدا جوں کی توں آ رہی تھی ـــــ بابر کو اپنے پاؤں بڑے وزنی محسوس ہونے لگے لیکن وہ
ہمت کر کے اپنے راستے پر تیز تیز ہو لیا ـ تین چار برگدوں کے قہقہوں نے اس کا پیچھا کیا اور آگے کے کئی برگد بڑبڑا کر جاگ
اُٹھے اور جاگنے کے باوجود خواب کی کیفیت میں اپنی داڑھیاں نوچنے لگے ـــــــــ بابر اتنا لرزنے میں مسکرانے
لگا اور مسکراتے مسکراتے اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ میں نے نہایت غصے کی حالت میں ایک مجرم کی داڑھی نوچی تھی کہ میرے ہاتھ
آگئی ـ

بابیں! تم؟ ـــ
ہاں، کیا کرتا بابر صاحب؟ آپ کو میری اصلی شکل پسند نہیں تو مجھے خیال آیا کہ سادھو مہاتما کیوں نہ بن جاؤں
لوگ سادھو کہیں گے تو لیتے آپ کو سادھوؤں کا ساہی لگوں گا ـــ
لیکن مہاتما جی، میری دانست میں تو آپ جیل بھگت رہے تھے ـــ میں بڑی مستعدی سے اسے پستول
کی زد میں رکھے ہوئے تھا ـــــ
اُس نے مجھے بڑی ملائمت سے بتایا جیل مجھے بھگت رہی ہے بابر صاحب ـــــ
وہ کیسے؟ ـــ
ایسے! ـــ وہ کسی چھلاوے کی طرح الٹی جست لگا کے پشت کی کھلی کھڑکی سے کود گیا ـــ اتنا بڑا او
جیالا آدمی تھا کہ اس کا پیچھا کرنے کو اس لیے جی چاہا کہ اس سے ایک اور ملاقات ہو جائے گی۔
بابر اندھا دھند سڑک پر چلا جا رہا تھا ـ اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر نامعلوم وہ کہاں دیکھ رہا تھا ـ اس
عین سامنے ـــ وہ ـــــ بڑا سا پتھر پڑا تھا اور پتھر پر چاندنی اوندھی ہو کر لیٹی ہوئی تھی اور اس کی رگ
میں سما گئی تھی جس سے اس میں جان پڑ گئی تھی ـــ اُن کی وہ ساری رات اسی طرح بیت جاتی تو شاید
وہاں پتھر کی بجائے کوئی سچ مچ کا جاندار پڑا ہوتا، کوئی آدمی، چوپایہ، پرندہ یا سانپ، لیکن ـــــ ا
تیز گام بابر کا پاؤں پتھر سے ٹکرا گیا، چاندنی بابر کے سائے سے ہڑبڑا کر الگ ہو گئی، پتھر پھر پتھر ہو گیا اور بابر
گرتے بمشکل بچا ـــــ ہہ ہا ہہ! ـــــ پیچھے سے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی ـــــ بابر نے اپنے کوٹ
اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالنا چاہا ـ لیکن اُسے یاد آیا کہ پستول تو اس کے سوٹ کیس میں
جو وہ اسٹیشن ماسٹر کے پاس چھوڑ آیا ہے ـــــ وہ مڑ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی آنکھوں کو سرچ لائٹ کے اند

انے لگا ـــ اور گھماتے گھماتے انھیں فوراً ایک جگہ پر ٹھہرا لیا ـ وہ ـــ وہاں چاندنی کے پیچھے درخت کے سائے میں کوئی انسانی خاکہ مسکرا رہا ہے! بابر کی آنکھیں اپنے اوپر پڑتے ہی وہ خاکہ درخت کے گہرے سائے کی طرف اچھل گیا لیکن بابر نے شاید اسے پہچان لیا تھا ـــ نہیں، یہ میرا وہم ہے۔ ایسے کیسے ہو سکتا ہے ـــ اپنا پاؤں سہلا کر اس نے پھر آباد سڑک پر چلنا شروع کر دیا اور کچھ دور جا کر اس کے اعصاب کا تناؤ کم ہوا تو وہ ڈھیلی ڈھیلی نظروں سے آس پاس دیکھنے لگا۔ لیکن بابر کی ویرانی کا اثر تھا یا کیا تھا کہ اس کی آنکھ بار بار اپنے ذہن کی طرف اُٹھ رہی تھی۔

بابر کا ذہن ایک پُر ہجوم شاہراہ بنا ہوا تھا اور کئی مجرم جنھیں وہ پھانسی دلوا چکا تھا اس شاہراہ پر اتنے چین اور آزادی سے گھوم رہے تھے کہ جیسے کہیں سے کٹے ہوئے راستوں کی بستیوں کے مکین معلوم ہوتے تھے۔ ان کے عمل و حرکت پر یہاں کوئی پابندی نہ تھی۔ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ خونی اور ڈاکو ہیں۔ کسی کو مر کے کہیں پہنچنا نصیب ہو تو وہ اپنی اچھائیوں کے سوا وہاں کچھ نہیں لا سکتا۔ بابر کو یقین تھا کہ سب کے سب یہاں بڑی بے ضرر اور نیک زندگی بسر کر رہے ہیں ـــ یہ لالو ـــ وہ روپا ـــ وہ بنتو ـــ موہنا ـــ راگھو ـــ سب کے سب اتنے سیدھے اور صاف ہیں کہ اپنی بجائے اپنے بھوت دکھائی دیتے ہیں ـــ

گزشتہ بار بھی حسب عادت جب وہ اپنی بیوی سے ان کی باتیں لے بیٹھا تو اس نے تنبیہ کیا ـــ ان بھوتوں کو ہر دم سر پر چڑھا رکھو گے ـــ تو ایک دن یہ تمھیں تمھارے دماغ سے باہر ہانک دیں گے۔ زندہ تھے تو تمھاری جان کے بیری تھے، اور اب مر کھپ چکے ہیں تو یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ تمھیں پاگل بنا کر چھوڑیں گے ـــ انھیں چھوڑو اور اپنی باتیں کرو ـــ

اپنی باتوں کے لیے ہی ان کی باتیں کر رہا ہوں نشو ـــ نہیں، پہلے پورا قصہ سن لو ـــ ہاں، تو جب مجھے اطلاع ملی کہ لالو اپنی محبوبہ کے ہاں آ پہنچا ہے تو میں فوراً پچیس جوان لے کر وہاں جا پہنچا ـــ تم لالو کو نہیں جانتیں، پچیس تو کیا پچیس سو میں سے بھی للکار کر صاف نکل جاتا، لیکن اب کے یہ ہوا کہ لاؤڈ اسپیکر پر میری آواز سنتے ہی وہ باہر آ گیا اور مجھ سے مخاطب ہو کے کہنے لگا ـــ اگر اعتبار کر سکتے ہیں بابر صاحب، تو اپنی پونی سے ملنے کے لیے ایک گھنٹے کی مہلت مانگتا ہوں ـــ میں پورے چھ بجے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دوں گا۔
ـــ اور وہ پورے چھ بجے آ گیا نشو ـــ

پر اب اس کے سوا اُس کے پاس اور چارہ ہی کیا تھا؟ ـــ

میں نے کہا نا، تم لالو کو نہیں جانتیں۔ اگر اسے اپنے وعدے کا پاس نہ ہوتا تو کسی بھی دوزخ کی دیواریں اس کے لیے کوئی اتنی اونچی نہ تھیں ـــ اُس نے گرفتاری کے بعد واپسی پر مجھے بتایا، میں بہت بُرا آدمی ہوں بابر صاحب، اپنی پونی کے سینے پر سر ٹکا لوں تو کم سے کم چار پانچ روز تک پورا فرشتہ بنا رہتا ہوں۔ پہلے ہی آپ میری یہ کمزوری …بت کر لیتے تو آپ کو کوفت نہ ہوتی ـــ اور نشو، آج تک وہ میرے ذہن میں محبت کے فرشتے کے مانند آباد …گئی بار ـــ منیسو نہیں۔ کئی بار تم سے ملے ایک عرصہ بیت جاتا ہے تو مجھے لگتا ہے، میں نہیں، میرا لالو تم سے

نے اُسے اپنی پناہ گاہ میں جالیا تو کہیں سے یہی کتا ـــــ ارے ہاں، یہی تو تھا ـــــــــــــــــ اُسے کاٹ کھانے کے لیے کود پڑا ـــ اور ـــ اور بابر نے اسے شوٹ کر کے وہیں ٹھنڈا کر دیا ـــ یہ کتا ـــ یہ ـ یہ تو ـــ بابر نے بڑے غور سے دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ کتا دراصل چپ چاپ کھڑا ہے اور اس کا اتنا بڑا سایہ چاندنی میں سے اچھل اچھل کر بھونک رہا ہے ـــ ایسے کیسے؟ ـــ نہیں، سایہ بھی خاموش تھا ـــــ اور کتا بھی ـ لیکن اس کے کانوں میں بھونکنے کی صدا جوں کی توں آ رہی تھی ـــ بابر کو اپنے پاؤں بڑے وزنی محسوس ہونے لگے لیکن وہ ہمت کر کے اپنے راستے پر تیز تیز ہو لیا۔ تین چار برگدوں کے قہقہوں نے اس کا پیچھا کیا اور آگے کے کئی برگد بڑبڑا کر جاگ اُٹھے اور جاگنے کے باوجود خواب کی کیفیت میں اپنی ڈاڑھیاں نوچنے لگے ـــــــ بابر انجانے میں مسکرانے لگا اور مسکراتے مسکراتے اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ میں نے نہایت غصے کی حالت میں ایک مجرم کی ڈاڑھی نوچی تھی کہ میرے ہاتھ آ گئی ۔

بائیں! تم؟ ـــ

ہاں، کیا کرتا بابر صاحب؟ آپ کو میری اصلی شکل پسند نہیں تو مجھے خیال آیا کہ سادھو مہاتما کیوں نہ بن جاؤں لوگ سادھو کہیں گے تو اپنے آپ کو سادھوؤں کا ساہی لگوں گا ـــ

لیکن مہاتما جی، میری دانست میں تو آپ جیل بھگت رہے تھے ـــ میں بڑی مستعدی سے اسے پستول کی زد میں رکھے ہوئے تھا ـــ

اُس نے مجھے بڑی ملائمت سے بتایا جیل مجھے بھگت رہی ہے بابر صاحب ـــــ

وہ کیسے؟ ـــ

ایسے! ـــ وہ کسی چھلاوے کی طرح الٹی جست لگا کے پشت کی کھلی کھڑکی سے کود گیا ـــــ اتنا نڈر اور جیالا آدمی تھا کہ اس کا پیچھا کرنے کو اس لیے جی چاہا کہ اس سے ایک اور ملاقات ہو جائے گی۔

بابر اندھادھند سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر نامعلوم وہ کہاں دیکھ رہا تھا۔ اس کے عین سامنے ـــ وہ ـــــ بڑا سا پتھر پڑا تھا اور پتھر پر چاندنی اوندھی ہو کر لیٹی ہوئی تھی اور اس کی رگ رگ میں سما گئی تھی جس سے اس میں جان پڑ گئی تھی ـــ اُن کی وہ ساری رات اسی طرح بیت جاتی تو شاید صبح وہاں پتھر کی بجائے کوئی سچ مچ کا جاندار پڑا ہوتا، کوئی آدمی، چوپایہ، پرندہ یا سانپ، لیکن ـــــ ار ـــ تیز گام بابر کا پاؤں پتھر سے ٹکرا گیا، چاندنی بابر کے سائے سے بڑبڑا کر الگ ہو گئی، پتھر پھر پتھر ہو گیا اور بابر گرتے گرتے بمشکل بچا ـــــ ہہ ہاہہ! ـــــ پیچھے سے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی ـــ بابر نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالنا چاہا۔ لیکن اسے یاد آیا کہ پستول تو اس کے سوٹ کیس میں رکھا ہے جو وہ اسٹیشن ماسٹر کے پاس چھوڑ آیا ہے ـــــ وہ مڑ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی آنکھوں کو سرچ لائٹ کے مانند اچھی

اتے انھیں فوراً ایک جگہ پر ٹھہرا لیا ـــ وہ ـــ وہاں چاندنی کے پیچھے درخت
مسکرا رہا ہے! بابر کی آنکھیں اپنے اوپر پڑتے ہی وہ خاک درخت کے گھرے سائے کی
سمیٹ لیے ہوئے لیا تھا ـــ نہیں، یہ میرا وہم ہے۔ ایسے کیسے ہو سکتا ہے ـــ اپنا پاؤں
پر چلنا شروع کر دیا اور کچھ دور جا کر اس کے اعصاب کا تناؤ کم ہوا تو وہ ڈھیلی ڈھیلی نظروں
ہی ویرانی کا اثر تھا یا کیا تھا کہ اس کی آنکھ بار بار اپنے ذہن کی طرف اٹھ رہی تھی۔

شاہراہ اونچا ہوا تھا اور کئی مجرم جنہیں وہ پھانسی دلوا چکا تھا اس شاہراہ پر اسے جن اور آدمی
سے کٹے ہوئے راستوں کی بستیوں کے مکین معلوم ہوتے تھے۔ ان کے عمل و حرکت پر
ہوتا بھی نہ سکتا تھا کہ وہ خونی اور ڈاکو ہیں۔ کسی کو مر کے کہیں پہنچنا نصیب ہو تو وہ اپنی انجانیو
بابر کو یقین تھا کہ سب کے سب یہاں بڑی بے ضرر اور نیک زندگی
ـــ وہ رویا ـــ وہ بنتو ـــ موہنا ـ راگھو ـــ سب کے سب اسے
جائے اپنے بھوت دکھائی دیتے ہیں ـــ

سر پر چڑھا رکھو گے ـــ گزشتہ بار بھی حسب عادت جب وہ اپنی بیوی سے ان کی باتیں
ـــ تو ایک دن یہ تمہیں تمہارے دماغ سے باہر ہانک دیں گے۔ زندہ تھے تو تمہاری
مر کھپ چکے ہیں تو بھی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ تمہیں پاگل بنا کر چھوڑیں گے ـــ انھیں

ہی ان کی باتیں کر رہا ہوں سنو ـــ نہیں، پہلے پورا قصہ سن لو ـــ ہاں، تو جب
نا محبوبہ کے ہاں آ پہنچا ہے تو میں فوراً پچیس جوان لے کر وہاں جا پہنچا ـــ تم لالو کو
پچیس سو میں سے بھی للکار کر صاف نکل جاتا، لیکن اب کے یہ ہوا کہ لاؤڈ اسپیکر پر میری
مجھ سے مخاطب ہو کے کہنے لگا ـــ اگر اعتبار کر سکتے ہیں بابر صاحب، تو اپنی پونی سے ملنے
میں پورے چھ بجے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دوں گا۔

ورچارہ ہی کیا تھا؟ ـــ
کا پاس نہ ہوتا تو کسی بھی دوزخ کی دیواریں اس
بتایا، میں بہت برا آدمی ہوں بابر صاحب
گزشتہ بنا رہتا ہوں۔ پہلے ہی آپ میری یہ کمزوری
میرے ذہن میں محبت کے فرشتے کے مانند آباد
ہے تو مجھے لگتا ہے، میں نہیں، میرا لالو تم سے

ملنے کو بے تاب ہے اور جی چاہتا ہے کہ کام وام سے بلا جھجک استعفا دے کر تمھارے پاس چلا آؤں۔
نہیں بھئی، بھول کے بھی ایسا نہ کرنا۔ کرو گے تو اُن آخری دنوں کا کیا ہوگا جو تمھاری پنشن پر ہمیں گاؤں کی حویلی میں باہم گزارنے ہیں ـــ
تم میرا مذاق اُڑا رہی ہو نشو، لیکن یہی تو میں کہہ رہا ہوں: جو محبت کرتے ہیں وہ صرف گھنٹہ بھر کی فوری رفاقت کی خاطر سولی سے بھی نہیں ڈرتے۔
نہیں بابا، تم دو دس ایسے اور محبت کرنے والوں کو سولی پر چڑھوا کر اُس وقت مجھ سے ملنے آؤ جب تمھاری ایک ماہ کی چھٹی جمع ہو جائے ـــ یہ تو تمھارے بڑے بھائی نے جائداد کے بارے میں وکیل کا نوٹس بھیجا ہے۔
بابر یک لخت اُداس ہو گیا اور آدمی غصہ یا خوشی میں جھوٹ بول سکتا ہے، لیکن اداسی میں وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے ـــ
ہم بھی کیسے بھائی ہیں نشو ـــ مجھے یاد آ رہا ہے کہ ایک بار ہم نے ایک قاتل کو یہ مشہور کر کے پھانس لیا تھا کہ اُس کا چھوٹا بھائی اچانک حادثہ پیش آ جانے سے ہسپتال میں پڑا ہے۔ کیا یہ کمینگی نہیں کہ کسی کو برائی کی سزا دینے کے لیے اُس کی اچھائی کو ایکسپلائیٹ کیا جائے؟ میرے بیشتر مجرموں کو اپنی برائیوں کی سزا اپنی اچھائیوں کے باعث ملی ہے نشو ـــ نشو، میں کئی بار سوچتا ہوں کہ میری فطری محبتیں ـــ میری زندگی کی اولین قدریں دم توڑ چکی ہیں، دستور اور قانون کی عادتوں سے میری زندگی کا اوپر اوپر تو سب ٹھیک ہے لیکن میرے اندر انسانیت کا جوہر مر چکا ہے۔
اس کی بیوی ہنس پڑی ـــ
میرے ابا کو ہماری شادی کے وقت یہی تو ایک اعتراض تھا مولوی صاحب، کہ آپ پولس کے آدمی ہیں۔
ہاں نشو، میں نے اپنی زندگی سے مذاق ہی کیا ہے کہ صرف پولس کا آدمی بنا رہا۔ میں نے زندگی سے قانون اور ضابطہ تو برتا ہے، لیکن انصاف نہیں برت پایا۔
بابر اپنے گرد و پیش سے غافل اس جنگل کے بیچوں بیچ سیدھی راہ پر چلا جا رہا تھا اور اپنے دل ہی دل میں بیوی سے ماضی کی ملاقاتیں دہرانے کے بعد اس وقت اُس کی غیر موجودگی میں اس سے یہیں مل رہا تھا ـــ
میں کھرا آدمی نہیں ہوں نشو، بلکہ عمر بھر اُن کھرے آدمیوں کے شکار میں لگا رہا ہوں جو محض ضابطہ میں دھوکا کھا کے اپنے اپنے مقام سے اکھڑ گئے، وہ جو بھی تھے، کھرے تو تھے، لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں جو بھی ہوں ایک کھرا نہیں ہوں۔ میں نے ہمیشہ پیشہ وری کی ہے، تم سے بھی یہی کیا ہے۔ تمھیں ساری عمر انتظار کرنا پڑا کہ کب میری پنشن ہو اور کب میں فرصت سے تم سے محبت کروں، ضابطے کے اس المیے پر غور کرو نشو، کہ ہم نے اپنی محبتوں کو بڑھاپے تک روکے رکھا ـــ کہ میرا بھائی کوڑی کوڑی کا محتاج ہے۔ لیکن میں اسے حساب کتاب سے ایک

کوڑی بھی زیادہ نہیں دینا چاہتا ہوں ـــــ ڈاکو بڑے بھولے ہوتے ہیں نشو اور محض اوپری ڈاکے کی کھٹا کھٹ سے بدنام ہو جاتے ہیں، اصل ڈاکہ تو یہ ہے کہ ڈاکو انسانیت کی نس نس کاٹ کر بھی قانون کا محافظ بنا رہے ـــ نشو جب میری ماں مر رہی تھی تو میں نوکری حاصل کرنے کے لیے بڑی مستعدی سے مقابلے کے امتحان میں بیٹھا ہوا تھا، اور جب گھر پہنچا تو مجھے دو خبریں ملیں، ماں کی موت کی اور اپنی نوکری کی، اور میں خوش تھا کہ چلو نوکری تو مل گئی ـــــ ڈاکو میں ہوں نشو، محبتوں کا ـــــ اور نفرتوں کا بھی نشو ـــــ جس سے بھی میں نے نفرت کی ہے اسے محبت سے اتنے زور سے بھینچا ہے کہ وہ لٹ پٹ جائے ـــــ تمہیں معلوم ہے میں تمہارے دولت مند باپ سے نفرت کرتا ہوں، لیکن گذشتہ سال جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ اپنی وصیت لکھ رہا ہے تو میں اس سے نہایت محبت سے پیش آتا رہا اور سچے دل سے محسوس کرتا رہا کہ جسے میں نفرت سمجھتا تھا اس میں دراصل میری یہی محبت کار فرما تھی ـــــ تمہارے ابا کی صحت اب کیسی ہے نشو؛ خیریت کی چٹھی تو آتی رہتی ہے نا؟ ـــ تم چپ کیوں ہو گئی ہو؟ شاید ناراض ہو گئی ہو کہ میں نے تمہارے ابا کے بارے میں اپنی نفرت کا ذکر کیوں کیا ہے۔ میں تو ـــــ میں تو محض بات کرنے کے لیے بات کر رہا تھا نشو ـــ میں ـــ میں تمہارے ابا کی عزت کرتا ہوں، لیکن تمہیں سمجھانا چاہ رہا تھا کہ میں نہایت چھوٹا آدمی ہوں۔ میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں نشو، کہ مجھ میں ڈاکو بننے کی بھی ہمت نہیں۔ میں ایک ادنیٰ چور ہوں اور اسی وجہ سے مجھے قانون کی تائید اور ڈاکوؤں کی سرکوبی کا حق حاصل ہے ـــــ تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو ـــــ ہے نا؟

اچھا بابا معاف کر دو ـــــ میں تمہارے ابا سے بھی معافی مانگ لوں گا ـــ خدا مجھے معاف کرے، جو شخص ہم سے اتنا وابستہ ہے کہ وصیت میں اپنی بے حساب دولت کا سب سے بڑا حصہ ہمارے نام لکھ دے وہ یقیناً ہماری تمام تر محبتوں کا حقدار ہے ـــ لیکن مجھے تسلیم ہے نشو، کہ میں بہت برا آدمی ہوں ـــ میں اعتراف کرتا ہوں ـــ نشو، مجھے اپنے سبھی گناہوں کا سچے دل سے اعتراف ہے۔

کہا جاتا ہے کہ چاندنی آدمی کو پاگل بنا دیتی ہے، شاید اس لیے کہ چاندنی میں آدمی کو سچ بولنے اور سوچنے کی ناقابلِ برداشت خواہش ہونے لگتی ہے ـــ بوڑھے برگدوں نے مجرم کا اعتراف نوٹ کر کے چاند کا شکریہ ادا کیا جسے ذرا سا سر ہلا کر قبول کر کے وہ بادلوں کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک بار پھر اپنے قدموں کی آواز سنتے ہوئے بابر کو احساس ہوا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے ـــــ کون؟ ـــ

وہی دھندلا سا انسانی خاکہ! بابر کو رکتے ہوئے پا کر وہ بھی ٹھہر گیا۔

تم؟

بابر کسی کو اپنے ذہن کی شاہراہ میں ڈھونڈنے لگا اور پھر وہاں سے اِدھر اُدھر کٹتی ہوئی سبھی راہوں کا چپہ چپہ اس نے چھان مارا اور جسے وہ ڈھونڈ رہا تھا وہ کہیں نہ ملا تو پھر اپنے سامنے کھڑے خاکے پر نگاہ جما لی۔

میں اگر واقعی میں ہوں تو پھر تم کون ہو؟ ـــــ بولو، کون ہو؟ ـــ کیا ـــ کیا ـــ؟

—— بولو بابر! —— بابر کو جواب دو! —— فرار ہونا چاہتے ہو؟ —— لیکن فرار ہونا چاہتے ہو تو میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟ —— تمہیں ڈر ہے کہ میں خود کشی کروں گا تو تم کیسے بچے رہو گے ۔ جاؤ، جاؤ بابر! میں تمہارے بغیر ہی اچھا ہوں ۔ قاتلوں اور خونیوں کی سچائیاں مجھے ہمیشہ بچائے رکھیں گی —— جاؤ بابر! بابر کا پیچھا چھوڑ دو ۔ جاؤ ۔ و! ۔ لالو —— رامو ۔ روپے —— موہنے سب آؤ! آؤ! اس شخص کو مار مار کر بھگا دو —— جان سے مار دو! —— موہنے! ۔ رامو! —— دیکھو بابر میری طرف بڑھ رہا ہے —— تمہاری طرح مجھے بھی گرفتار کرنا چاہتا ہے ۔ خبردار! ایک قدم بھی اور آگے بڑھایا تو تمہارا گلا گھونٹ دوں گا —— بچاؤ! ——

چاند بادلوں میں گھس گیا تو چاروں طرف اندھیرا چھا گیا ۔

خبردار! ——

بابر اپنی جان بچانے کے لیے سرپٹ دوڑنے لگا —— اور برگدوں نے صلاح و مشورہ ختم کر کے آخری فیصلہ کیا اور اپنی جگہوں سے اکھڑ اکھڑ کر اس کی چاروں طرف گھیرا ڈال لیا ۔ بچاؤ —— گھر آتنگ ہوتا گیا —— اور تنگ! ——

بچاؤ! —— اور تنگ! ——

بہت ڈراما ہو لیا بابر! ۔ اب ہاتھ اونچے کر لو! —— ہم نے تمہارے سسر کے خون کے سارے ثبوت فراہم کر لیے ہیں!! ——

پیچھے

میں اور وہ (وہ کون ہے؟) سیدھے یہیں چلے آئے ہیں۔

کتنا چوڑا دریا ہے! ان لوگوں نے ہمیں بتایا ہے کہ پچھلے تین چار سو سال سے یہ دریا ہر سال کناروں پر ایک ایک انچ بڑھتا جا رہا ہے۔ کبھی اتنا چھوٹا ہوگا کہ ادھر سے کسی کو اُدھر کچھ کہنا ہوتا تو یہیں بیٹھے بیٹھے ذرا سی آواز دے دیتا ـــ سن رہے ہو؟ بابر ہندوستان پر چڑھ آیا ہے ـــــ چڑھ آیا ہے تو کیا ہوا؟ اپنے آپ اتر بھی جائے گا ـــ اور نہ اترا تو؟ ـــ تو بھی کیا؟ تو اُسے رہنا پڑ جائے گا ـــ اور رہ گیا تو ـــ رہ گیا تو اچھا ہی ہے، رحمت بن کر رہے گا! ـــ ہاں اس دریا میں کتنے سیلاب آئے ہوں گے، اور جو سیلاب نہیں اترے ہوں گے ان سے دریا اور چوڑا ہوتا گیا ہوگا تا کہ سیلابی حالت بنی رہے۔ پانی کو اگر بہتات میں بہتے چلے جانا ہے تو تنگ کناروں کا ڈھے ڈھے کے پیچھے سرکتے جانا فطری ہے اور کنارے پیچھے ہٹتے جائیں تو اِس دُنیا اور اُس دُنیا میں فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ پہلے تو لوگ کود کر یہاں سے وہاں جا پہنچتے تھے۔ یہ ذرا سا تو فاصلہ تھا لیجیے، جگت تپا، آ گیا ہوں! ـــ اور جگت تپا کا کام انجام دے کر اسی طرح کود کے واپس آ گئے، اِدھر گیا اور اُدھر کیا؟ کسی کو تعجب نہ ہوتا تھا کہ یہ شخص تو مر چکا تھا، اب جوں کا توں جی کیسے پڑا؟ ـــ لیکن اب تو دوسرا کنارہ اتنا دور ہو گیا ہے کہ کنارے کے آگے پہاڑوں کا سلسلہ پانی سے ہی اُبھرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ تا حد نظر پانی ہی پانی ہے اور پانی کی تیکھی اور گاڑھی لہریں تیز تیز سانس لیتے ہوئے بے سدھ بھاگی جا رہی ہیں ـــ ازل سے ابد تک، اور انھیں درمیان سے چیر کر ہمیں دوسرے کنارے پر پہنچنا ہے۔

اوروں کے ساتھ میں اور وہ (وہ کون ہے؟) کشتی میں آ بیٹھے ہیں اور کشتی کے آگے اور پیچھے دونوں طرف آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ملاحوں نے ایک دوسرے کو بڑی گہری مسکراہٹ سے دیکھا ہے جیسے روانگی سے پہلے اپنے اپنے دوسرے سارے رشتے توڑ کر ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے ہوں اور پیوست ہو کر چاروں کے چاروں یک روح ہو گئے ہوں اور یک روح ہو کر ان میں اعتماد آ گیا ہو کہ اب ہمیں وہاں پہنچنے سے کون روک سکتا ہے۔ اور کشتی حرکت میں آگئی ہے اور اس کے آگے لہریں کٹنے لگی ہیں اور کٹ کٹ کر اس کے پیچھے اپنے آپ جڑتی جارہی ہیں اور اپنی بھاگا بھاگ میں انھیں کٹنے کا احساس ہو رہا ہے نہ جڑ جانے کا ۔۔۔ اور چاروں ملاحوں نے یک آواز گانا شروع کردیا ہے۔

لہرو، ہمیں روکو نہیں۔

لہرو، ہمیں جانے دو۔

لہرو، ہمیں روک لیا تو تمھیں ہمارے لیے روٹیاں پکانا پڑیں گی۔

اور جھونپڑے بنوانا پڑیں گے۔

اور کپڑے سلوانا پڑیں گے۔

لہرو، ہمیں روکو نہیں۔

لہرو، ہمیں دور سے دیکھ لو اور جانے دو۔

ملاح اپنے سارے بدن سے گا رہے ہیں اور ہمارے ذہن دیکھ رہے ہیں کہ ان کی آوازیں ہاتھوں میں ہاتھ باندھے ہنستے کھیلتے پانی پر چل چل کر وہاں اس پار پہنچ رہی ہیں اور ہم منجدھار میں آپہنچے ہیں۔ ہم وہاں سے چلے تھے جہاں بستی ہی بستی ہے اور وہاں جارہے ہیں جہاں ویرانہ ہی ویرانہ ہے۔ چلنے سے پہلے بستی کے چند پنڈتوں نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ اس موسم میں اُدھر مت جاؤ، اور جانا ہی ہے تو جیون کا انتم پاٹھ ہم سے یہیں بستی کے کنارے پڑھوا جاؤ۔ اور ان کی باتیں سن کر ہماری ننھی منی وھندلی سی مسکانیں ڈر کر ہمارے منھوں سے اڑ گئیں اور ہم نے کبوتروں کی طرح آنکھیں موند لیں لیکن ملاحوں کے مردانہ قہقہوں نے ہماری کایا کو بدلنے سے بچا لیا ۔۔۔۔ ڈرو نہیں بابو، آؤ۔ اسی موسم میں تو مورتیوں کا پتھر پگھلتا ہے اور ان کے سانسوں سے ویرانہ آباد ہوتا ہے۔ ڈرو نہیں ۔۔۔ دوسرے موسموں میں دریا کا لمبی تان کر سویا ہوتا ہے تو لوگوں کی بھیڑ کی بھیڑ ادھر جا پہنچتی ہے اور ان کے وہاں پہنچتے ہی مورتیاں پھر پتھر کی پتھر ہو جاتی ہیں۔ بھگوان کی مہما دیکھنے کا سمے تو اسی وقت ہے ہمت کر کے آؤ اور دیکھو آج کل ویرانے میں زندگی کی کیا بہار آئی ہوئی ہے۔ اس طرف ہم لیے ہوئے ہیں اور اس طرف سانس لیتی ہوئی مورتیوں کا ہجوم ہے۔ رکو نہیں بابو، پانی سے کیا ڈر؟ ۔۔۔۔ ہر شخص اپنے بدن میں ہی پانی میں ڈوبا ہوتا ہے ۔۔ آؤ! ۔۔ اور میں اور وہ (وہ کون ہے؟) اور چند اور یاتری دلوں تک ڈوبے ہوئے یہاں کشتی میں آ بیٹھے۔

کھولا ہے تو ہماری ہنسی اس سرنگ کے پٹ کھلتے ہی اس میں داخل ہو کر غائب ہوگئی ہے۔

کیا مجھے کھانے کو کچھ مل سکتا ہے دوستو؟

ہاں، یہ لو بابا، یہ کیلے کھالو۔

لاؤ تمہیں دیکھ کر میں اس لیے ہنس پڑا دوستو، کہ چلو بھوک مٹنے کا حیلہ تو پیدا ہوگیا۔

دیوانے بابا نے کیلے کو چھیل سمیت منہ میں ڈال لیا ہے۔

اور روئے کیوں؟

رونا اس لیے آگیا دوستو، کہ تم آتو گئے ہو لیکن کب اور کہاں آئے ہو؟ ـــــ کسی کا ہونا اور آنا تو اس وقت ہوتا ہے دوستو، جب کوئی نہایت پرانے ماضی سے اچانک باہر آجائے اور اس کی آمد پر پتھر کے پہاڑ میں اندر ہی اندر خلا ہوجائے اور وہ غار کا غار اس کی دھڑکنوں سے جی پڑے ـــــ آؤ دوستو! وہ ـــــ وہاں اس ستون کے پاؤں میں ایک گڑھا ہے اور اس گڑھے میں ایک سوراخ ہے! ـــــ باری باری دیکھو ـــــ باؤلی باتیں اسی وقت سمجھ میں آتی ہیں جب ہم باتوں کے جسم بھی دیکھ لیں۔ دیکھو!

میں نے سوراخ پر سر جھکا لیا ہے۔ غار میں باہر کی روشنی کی ایک ہی کرن اپنے آپ سے کھیل رہی ہے اور اس کی نم آلود مدھم روشنی سے میں اپنے چہرے پر ٹھنڈک محسوس کرنے لگا ہوں اور آنکھیں جھپکائے بغیر لگاتار دیکھے جا رہا ہوں اور میری نظر میں یہ منظر بسا ہوا ہے کہ شیام سندر، بال کرشن غار میں کھڑا ہے اور اس کے پُرنشاط سانس سے بانسری کے سُر پھوٹ رہے ہیں اور اس کے ارد گرد مکھن کے پیڑوں جیسی سندر اور ملائم گوپیاں لسی میں تھئی تھئی اچھل اچھل کے بے سدھ ناچتی جا رہی ہیں اور ناچ ناچ کر ان کی ملائمت گاڑھی ہو رہی ہے اور نقش تیکھے نکلتے آرہے ہیں بھئی ـــــ تھئی! ـــــ پتھروں سے زندگی کا دودھ نچڑ رہا ہے! ـــــ

کسی نے ہلکے سے میرا شانہ دبا کر مجھے سوراخ سے اُٹھنے کو کہا ہے اور میں نے اپنا سر اوپر نہیں اٹھایا ہے بلکہ سارا غار ہی اوپر اٹھ آیا ہے، اور میں سیدھا کھڑا ہوگیا ہوں تو میں اور وہ (وہ کون ہے؟!) ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک کر ایک دوسرے کے سر میں وہی غار کا منظر دیکھے جا رہے ہیں ـــــ

دیوانے بابا کے قہقہے کی آواز سے ہم سب یاتری اپنے انہماک سے چونک پڑے ہیں۔

آنا تو وہی ہے دوستو، جو صدیوں پہلے آیا ہو اور اگر جیون کی کسی نہ کسی جھلک میں رہ گیا ہو! ـــــ لاؤ، دو اور کیلے دے جاؤ دوستو۔

دو کیا؟ لو چار اور کھاؤ بابا۔

لاؤ۔ بابا نے کیلوں کو منہ سے کھانے سے پہلے اپنی بھوکی نظروں کو دعوت دی ہے ـــــ لو بابا کی آنکھو تم بھی کھاؤ!

ویل کم ٹو دا گیوز!

ابھی تک نہیں سمجھے دوستو، تو کیا سمجھو گے؟ ان مورتیوں کو بنانے والا کوئی نہیں جن مورتیوں میں جان
...ی ہے وہ آپ ہی آپ بن جاتی ہیں —— جاؤ اب! تمھارے کیلوں سے میرا پیٹ بھر گیا ہے —— جاؤ —
...ین تم آئے ہی کیسے تھے کہ چلے جاؤ گے؟ —— نہیں، اب مجھے کچھ اور سننا ہے نہ کہنا ہے —— جاؤ اب!

ہم پاگل پروفیسر بابا کو چھوڑ کر اسی راستے پر آگے ہو لیے ہیں اور ابھی چند ہی قدم چلے ہیں کہ راہگزر کے
...یں کنارے پر ہمیں ایک جیوتشی کی سی صورت دکھائی دی ہے وہ گھٹنے ٹیکے، سر جھکائے، ہاتھ میں کھلی پتنک لیے
...وئے ہے اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں پر شاید ستاروں کا حساب لگا رہا ہے پہلے تو مجھے خیال گزرا ہے کہ شاید وہ
...وئی مورتی ہی ہے لیکن پروفیسر بابا کے واقعہ کا خیال کر کے میں مسکرانے لگا ہوں اور آگے بڑھ کر جیوتشی کو اپنی طرف
متوجہ کرنا چاہا ہے۔ اس نے سر اوپر نہیں اٹھایا ہے تو میں نے شرمندہ ہو کر جھجکتے ہوئے اس کے کندھے کو چھوا ہے
کہ وہ میری طرف دیکھے اور —— مجھے پتھر چھونے کا احساس ہوا ہے اور میں نے سوچا ہے کہ شاید وہ صدیوں سے
...ے یوں ہی ستاروں کے حساب کتاب میں الجھ کر بیٹھا ہے اور اپنے انہماک میں پتھر ہو گیا ہے —— اور میں نے
اُسے دوبارہ چھونے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی ہے کہ پروفیسر بابا کی آواز ٹھاٹھیں مارتی ہوئی مجھے بہائے گئی ہے۔
جس مورتی کو بھی چھوؤ گے دوستو، وہ پتھر ہو کر رہ جائے گی —— اور میں اور وہ (وہ کون ہے؟) گھبرا کر سیدھے کھڑے
ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ہم دونوں کو گمان ہوا ہے کہ ہم پروفیسر بابا کو بھی چھو
لیتے تو وہ پتھر ہو جاتا —— اور —— عجیب بات ہے —— جب وہ (وہ کون ہے؟) اور وہ...ں
ہیں شامل ہونے کے لیے میرے ساتھ اُدھر مڑنے لگا ہے تو میں نے اسے اسی نیت سے چھو لیا ہے کہ وہ پتھرا جائے اور
پتھر ہو کر مجھے صاف دکھائی دینے لگے، لیکن کیا یہ بھی عجیب نہیں کہ اسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور وہ ویسے ہی پرچھائیں
کی پرچھائیاں —— وہ میرے آگے آگے جا رہا ہے!

اس نئے راستے میں داخل ہوتے ہی ہم ایک بڑے کشادہ غار کے سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں اور اس کے اندر
پہاڑ کے باطن میں پہنچ کر اپنے آپ کو بدھ کی ایک بہت بڑی مورتی کے سامنے پایا ہے۔ بدھ کے سر کا جوڑا چھت تک
پہنچا ہوا ہے اور اس کے جھکے جھکے شانت نین غار کے دروازے پر ٹکے ہوئے ہر آنے والے کا انتظار کر رہے ہیں
—— جو بھی پہنچ جائے۔ مجھے اسی کا انتظار تھا۔ مجھے کسی خاص ایک کا انتظار نہیں، تم آ گئے ہو تو مجھے تمہارا ہی انتظار
تھا —— بدھ کی نظر گہرے پانی کی طرح ٹھہری ہوئی ہے اور گمبھیرتا سے مسکرائے جا رہی ہے۔ کچھ اس طرح کہ صرف گمبھیر ہو تو ٹھہر
نہ ہو، اور صرف مسکرا رہی ہو تو اس میں روشنی کا ہلکا پن نہ ہو —— اور اتنی قریبی ہے کہ ہمارے چہروں کی بجائے
دلوں پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک کو معلوم ہو رہا ہے کہ بدھ صرف اسی کی طرف تک رہا ہے، میں نے اس کی طرف یہاں
اس کونے سے دیکھا ہے اور اس کی ٹٹولتی ہوئی پُرچین نظر سے بے چین ہو کر یہاں چلا آیا ہوں اور یہاں سے بھی
میری آنکھیں بے اختیار بدھ کی جادوئی آنکھوں کی طرف اٹھ گئی ہیں جو وہیں ٹھہرے ویسے ہی یہاں بھی مجھے دیکھے
جا رہی ہیں اور میں تعجب سے وہاں ہو لیا ہوں —— اس آخری کونے میں اور —— اور یہاں بھی اس کی نظر کی

ماکن مسکراہٹ مجھے ویسے ہی بڑی قریبی دلچسپی سے ٹٹول رہی ہے ـــــ میرے سارے ساتھی بھی جگہیں بدل بدل کے
چھپی چھپی آنکھیں بدھ کے چہرے کی طرف اٹھا رہے ہیں اور بدھ اپنی گردن کو عین اسی ایک جگہ پر ٹکائے ہماری ہر نئی
بلکہ ہر ایک ایک کو اسی بے جھجک ہمدردی سے دیکھے جا رہا ہے۔ اس کے لیے ہماری محبت مشترک ہے لیکن ہم سب کے
لیے اُس کی محبت الگ الگ ذات سے ہے۔ مگر سپنے بدھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے میں نے اچانک محسوس
کیا کہ اس کی آنکھوں کی دونوں ساکن پتلیوں میں وہ (وہ کون ہے ؟) میری طرف منہ کیے ہوتے ہے، اور بدھ کی
نظر مجھ پر جمی ہوئی ہے لیکن وہ مجھے دیکھ نہیں رہا ہے ـــــ میں گم ہو گیا ہوں، شاید میرے دوسرے ساتھی بھی گم ہو گئے
ہیں اور ہم بھی غار کے باہر آ گئے ہیں اور ـــــ اسی بے خبری کے عالم میں ذرا آگے جا کے ایک نئی راہ میں مڑ گئے ہیں اور
ـــــ ہائیں، یہ کیا ؟! ـــــ ہم نے پہلے تو تحیّر سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ہے
اور پھر اپنے سامنے ـــــ یہاں مورتیوں کا ایک پورا نگر آباد ہے ! ـــــ سڑک پر ادھر
اُدھر کئی لوگ آ جا رہے ہیں۔ دکانیں سجی ہوئی ہیں اور دکاندار خریداروں سے بھاؤ ٹھہرا رہے ہیں۔ اُن کی خریدی ہوئی
چیزیں انھیں سونپ رہے ہیں۔ یا اگر دکان پر کوئی گاہک نہیں تو سڑک پر خالی خالی نظریں لٹکائے ہوئے ہیں۔ آئیے،
ذرا تیز تیز آئیے ! ـــــ وہ رتھ بڑی رفتار سے ادھر ہی آ رہا ہے اور یہ آدمی سڑک کی دوسری طرف جانے سے پہلے
سوچ رہا ہے کہ ذرا تھم جائے، یا رتھ کے یہاں پہنچنے سے پہلے جلدی جلدی سڑک کو پار کرے ـــــ اس گائے کو یہ بوڑھا
نا معلوم کیا کھلا رہا ہے اور گائے پونچھ ہلا ہلا کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کے چہرے کو بھی دیکھ رہی ہے اور
اس کے چہرے کے پیچھے سبزی بھاجی کی دکان پر بھی اُس کی نظر ہے ـــــ یہ پھول والی ! آئیے اس سے پھول لیتے
ہیں ـــــ مگر ـــــ مگر پھول والی نے ہماری طرف دھیان ہی نہیں دیا ہے، شاید بہری ہے ـــــ ہاں اندھی
بھی ـــ نہیں، اندھی تو نہیں ہے۔ پھولوں کا ٹوکرا اس کی پیٹھ پر لٹکا ہوا ہے۔ میں نے اسے چھونا ذرا سا جھنکنا چاہا ہے
جس مورتی کو بھی چھوؤ گے دوستو، وہ پتھر ہو کر رہ جائے گی ! ـــــ میں رُک گیا ہوں ! ـــ پھول والی ! ـــ پھول ـــ !
اُس نے جواب میں ہمیں دیکھا بھی نہیں ہے اور ہم شرمندہ سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ ـــــ وہاں چند لوگ ارتھی کے
ساتھ جا رہے ہیں ارتھی کے پہلو میں وہ نوجوان شاید مرنے والے کا بیٹا ہے۔ سر منڈوائے، صرف دھوتی پہنے، ننگی
چھاتی پر جنیئو کا ایک سوتی تار ایک ہاتھ میں لیے اور دوسرے ہاتھ میں پانی کا لوٹا اٹھائے ننگے پاؤں باپ کی ارتھی کے
ساتھ ساتھ چل رہا ہے اور دل ہی دل میں اگلے چند دنوں کے سارے سنسکار پورے کرنے کا خاکہ تیار کر رہا ہے ـــــ یہ
راستہ شاید شمشان گھاٹ کو جاتا ہے ـــ ارے بھائی ٹھہرو، یہ راستہ کدھر جاتا ہے ؟ ـــــ میں نے ایک راہگیر سے پوچھا
ہے لیکن پھول والی کی طرح اُس نے ہماری طرف سر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا ہے ـــــ تو ـــ تو کیا ـــ کیا ـــ ؟
ـــــ ہاں، ہو سکتا ہے ہم یہاں موجود نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے ہم سرے سے ہوں ہی نہ ـــــ ہم نے چاروں طرف حیرت
سے نگاہیں دوڑائی ہیں اور ہمیں یقین ہونے لگا ہے کہ یہاں سبھی لوگ ہماری موجودگی سے بے خبر ہیں، ہم انھیں
نظر آ دکھائی نہیں دے رہے ہیں، محسوس نہیں ہو رہے ہیں ! ـــــ یہاں وہ ہی وہ ہیں یا ہم ہی ہم ـــــ لیکن

یہ بستی اُن ہی کی تو ہے۔ اُنہی کا رونا دھونا، جینا مرنا، ہنسنا کھیلنا تو سارے آس پاس میں بسا ہوا ہے ——
وہ تو سارے ہیں ہی، ہم ہی نہ ہوں گے ——

ہم بوکھلا گئے ہیں اور تیزی سے سڑک کے باہر نکل آئے ہیں اور دریا کے کنارے آ پہنچے ہیں اور بدستور بوکھلاہٹ سے اپنے سر پلٹا کر دیکھا ہے —— سڑک کے باہر ایک نہایت بوڑھا آدمی ——
اتنا بوڑھا کہ اِس کے سوا اور کوئی شکل ذہن میں نہیں بنتی کہ وہ بے حد بوڑھا ہے اپنی ڈاڑھی پھیلائے اور بال بکھرائے دریا پر ٹکٹکی باندھے ہوئے ہے! —— میں آپ کو نہایت ایمانداری سے بتا رہا ہوں کہ اس بوڑھے کی مورتی کو گھور گھور کر دیکھتے ہوئے ہم سبھی ایمان لے آئے ہیں کہ اس وقت یہاں صرف وہی رہ گئے ہیں، سارے کے سارے وہ، اور یہ پہاڑ اور دریا کا یہ بہتا ہوا پانی —— ہم اپنی غیر موجودگی کے احساس سے ایک خالی ناؤ میں آ بیٹھے ہیں جسے ملاحوں نے کچھ کہے بغیر بستی کی طرف لے جانے کے لیے کھول دیا ہے اور پانی کے تلاطم میں اسے بڑی مہارت سے کھینے لگے ہیں اور پانی میں تھوڑی دور آ کے مجھے اچانک خیال آیا ہے کہ وہ تو (وہ کون ہے؟) پیچھے ہی رہ گیا ہے۔

بے محاورہ

مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ میرے اتنے صاف ستھرے کمرے میں یہ مکھی کہاں سے چلی آئی ہے۔ اس قدر گندگی سے کہ نظر ہٹا لینے پر بھی سامنے ہی رہتی ہے۔ میرے ملاقاتی نہایت صفائی پسند ہیں اور چہروں کو اتنا چھپا کر آتے ہیں کہ دکھائی ہی نہیں دیتے۔ ذہن میں ان کی کوئی شکل ہی نہیں بنتی۔ میں انھیں چہروں کی بجائے ان کے اُجلے کپڑوں سے ہی پہچانتا ہوں۔ یا اُجلے کپڑوں سے بھی نہیں پہچان پاتا تو اِسے وہ اور اُسے یہ سمجھ کر ہر ایک سے باتیں کیے جاتا ہوں اور بڑی بات اس لیے نہیں بگڑتی ہے کہ مجھے کسی سے کوئی خاص بات نہیں کرنا ہوتا ہے، بس مسکرا مسکرا کر محض باتیں ہی کیے جانا ہوتا ہے ـــ لیکن وہ غلیظ مکھی اتنی پُرشکل ہے کہ اُسے دیکھ کر مجھے صرف اُسی کا خیال آرہا ہے۔ وہ میری ساری توجہ کو سمیٹے ہوئے بڑے مزے سے لگاتار بھنبھنائے جا رہی ہے، گویا اُسے یقین ہو کہ وہ عین وہیں آ پہنچی ہے جہاں اُسے پہنچنا تھا ـــ میری نظر اُس بھدّے سے بھن بھن کرتے ہوئے دھبّے پر اٹکی ہوئی ہے ـــ یہاں ـــ نا ـــ وہاں اُس تصویر میں وہ اُس درخت کی ٹہنی سے چھوٹی ہے اور فریم کے شیشے سے پھسل گئی ہے اور نیچے گلدان میں رکھے ہوئے گلاب کے پھولوں کے آس پاس منڈلانے لگی ہے۔

ہائے ویٹو، رینو کو میں پہلی بار اپنے فلیٹ میں لایا تو اُس نے مجھ سے کہا۔

"تمھارے گلاب کتنے خوب صورت ہیں! کہاں سے منگواتے ہو؟"

"پلاسٹک گڈز کی ایک دکان سے، رینو۔"

"سچ؟ ـــ ہائے، سچ مچ کے گلاب ایسے کیوں نہیں ہوتے؟ ـــ اور ـــ اور یہ کیا، ڈارلنگ؟ تمھارے بالوں میں سے تو رات کی رانی کی خوشبو آرہی ہے؟"

• ہاں ڈارلنگ، یہ ایسے ہی ہے جیسے مجھے تمھارا چہرہ تو عورت کا ہی اچھا لگتا ہے مگر خصلت گھوڑی کی، ذرا سی جھنک
ر بھی ہوا میں اڑائے جاتی ہے۔"

"ہاؤ ناٹی!"

• نہیں، اس میں ناٹی والی کیا ہے؟ جو شکل پسند ہو وہی دیکھو اور جو روح پسند ہو اُسے اُس شکل کے اوپر اوپر

ل دو ــــ"

ہاں، کیا ضروری ہے کہ گلاب سے گلاب ہی کی خوشبو آئے؟ ہماری مشکل دراصل یہ ہے کہ ہم آج بھی روح کو
بہتر کی کوئی شے سمجھ بیٹھے ہیں۔ کوئی اچھا سا سائنس داں ہو جو ہمیں سمجھائے کہ جیتے جاگتے وجود میں بھلا کوئی جگہ کہاں
ہوتی ہے کہ روح وہاں مکان کرے اپنے آپ میں یا تو اپنا سارا آپ جوڑ کر رکھو یا اُسے، جسے تم روح کہتے ہو ــــ سچ مچ کا
گلاب، سچ مچ کا بندر۔ سچ مچ کا آدمی ــــ سچ پوچھیں تو یہ سب جھوٹ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں سچ مچ کا آدمی
نہیں ہوں ــــ میرا مطلب ہے، اسی لیے سچ مچ کا آدمی نہیں ہوں کہ واقعی سچ مچ کا آدمی نہیں ــــ میرا بڑا بھائی
غریب سچ مچ کا آدمی ہے اسی لیے جھوٹ موٹ سا لگتا ہے۔ گذشتہ کئی ماہ سے معدے کے کینسر سے تڑپ رہا ہے۔
اُس کا ایک پھول سا بچہ ہے جو بہت خوش ہے کہ ڈیڈی مجھ سے کھیلنے کے لیے سارا دن گھر میں ہی رہتے ہیں۔ دوسرا بچہ
ابھی اپنی ماں کی کوکھ میں ہے اور بندھے ٹکے وقت سے پہلے باہر نہیں آئے گا، تب تک خواہ اس کا باپ رہے (خواہ نہ رہے
ــــ یہ بچہ مجھے اپنے جیسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کئی سال پہلے جب میں انگلینڈ میں تھا تب مجھے یہاں سے اپنے باپ کی
طویل چٹھی موصول ہوئی کہ آخری دموں پر ہوں، فوراً آؤ اور مل جاؤ۔ چٹھی پڑھ کر مجھے اپنے آپ کو یہ باور کروانے میں ذرا
بھی وقت نہ ہوئی کہ بھئی، تمھارا باوا تو نا سمجھ ہے۔ تم ہی سمجھ سے کام لو ــــ مجھے اپنے بڑے بھائی کا نازائیدہ بچہ بہت
اچھا لگنے لگا ہے اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے، پہلے ذرا جھجک کر، پھر بے ٹوک، کہ بڑا بھائی اس دوران چل بسا تو نووارد
کو میں اپنا قانونی بیٹا بنا لوں گا ــــ ہاں، ٹھیک ہی تو ہے، سو جھنجھٹوں کے بعد آدمی کو باپ بننا نصیب ہوتا ہے مگر میرا کام
ہاتھ پیر ہلائے بغیر ہی بن جائے گا ــــ نہیں، ہاتھ پیر ہی کیا۔ میں نے اپنا سارا بدن ہلایا تھا۔ میرے بڑے بھائی
کا نازائیدہ بچہ دراصل میرا ہی ہے۔ اپنی دانست میں ہم نے اس کی آمد کو روکنے کے لئے سارا بندوبست کر لیا تھا لیکن تقل
جوں کے توں پڑے رہ گئے اور ماں نے اعلان کیا کہ وہ اپنے آپ ہی چوروں تک پہنچ جائے گا۔ بھابی اور میں ــــ
نہیں، چھوڑیے ساری تفصیل یاد کر کے مجھے کوئی قصہ تھوڑا ہی گھڑنا ہے وہ عورت تھی اور میں مرد، سو جو ہونا تھا وہ ہو گیا
ــــ میرا بھائی بڑا بھولا ہے۔ پھر بھی ایک بار اُسے جھوٹا سچا شک سا ہو گیا۔ بھابی گھبرا گئی۔ گنہگار عورت کو
پکڑے جانے کا ڈر لاحق ہونے لگے تو اُسے بچ لینے کے خیال سے اس کے مرد ساتھی کی انا کی بڑی تسکین ہوتی ہے۔
بڑے بھائی کے سامنے میں نے بھابی سے اس طرح پیش آنا شروع کر دیا گویا اُسے ماں کے روپ میں ہی دیکھتا ہوں ــــ نہیں؟ ــــ
کیوں؟ اس میں جھوٹ بھی کیا تھا؟ اس کی کوکھ میں بچہ پلنا شروع ہو ہی چکا تھا ــــ میرے نیک بھائی
کو دل ہی دل میں اپنے اتنے بڑے گمان پر پچھتاوا ہونے لگا۔ اتنا سچ مچ کا آدمی ہے کہ مجھے جھوٹ موٹ کا آدمی بھی معلوم نہیں

ہوتا ـــــ

کوئی اور نامعلوم کیا سوچے ۔ میں تو جو کچھ بھی سوچ رہا ہوں اُسے ہو بہو کیے جا رہا ہوں ۔ دراصل کسی کو بُرا کہہ کر ہم جھٹ اپنی نیکی پر ایمان لے آتے ہیں ۔ بُرے کی بُرائی میں ایک بُنیادی اچھائی یہ ہوتی ہے کہ نیک نامی کو وہ اپنے لیے کوئی مسئلہ نہیں بنائے ہوتا ہے ۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اُسے بُرا یا اچھا سمجھ کے نہیں کرتا ہے ، بس اس لیے کرتا ہے کہ اپنے منطقی روزمرہ میں اُسے خلل پیدا کرنا پسند نہیں ، اس لیے جب میرے بڑے بھائی نے اپنی بیماری کے اوائل میں دبی زبان سے تجویز کیا کہ اپنا فلیٹ چھوڑ کر اُن کے ساتھ رہنے لگوں تو میں نے مشکوک سی حامی تو بھر لی مگر ان کے ساتھ رہنے کو گیا نہیں ، نہ ارادہ ہے ۔ بھابی بھی کئی بار کسی حاملہ گائے کی طرح بڑی خاموش آنکھوں سے کہہ چکی ہے ، میرے لیے ہی آ جاؤ نا ، ـــــ لیکن میں ایک عرصے سے بڑا گوشت کھانے کا عادی ہو چکا ہوں ـــــ تمھارے ساتھ میرا وقت اچھا کٹ گیا اور میرے ساتھ تمھارا ، سیدھے لین دین کی بات ہے ، اب تمھارے لیے میں اپنا وقت کیوں برباد کروں ؟ ـــــ ڈاکٹروں نے بڑے بھائی کے فوری آپریشن کا مشورہ دے رکھا ہے اور ساتھ ہی یہ رائے کہ آپریشن سے بھی فائدہ وائدہ نہیں ہونے کا ۔ بیس پچیس ہزار کے خرچ سے بس کوشش کر لینے کی تسکین حاصل کی جا سکتی ہے ـــــ اب کوشش بھی کرو اور بیس پچیس ہزار کا خرچ بھی ، جسے پورا کرنے کے لیے آٹھ دس ہزار کی توقع مجھ سے بھی کی جا رہی ہے ـــــ کوئی عقلمند بتائے کہ یہ کہاں کی عقل مندی ہے ۔ بھائی نے تو مرنا ہی ہے (آپ فکر نہ کیجیے بھائی صاحب آپ کے پیچھے میں جو ہوں ! بچوں کو یتیم ہونا ہی ہے (تمھیں اعتراض نہ ہو بھابی تو اپنے بچے کو میں اپنا قانونی بچہ بنانے پر تیار ہوں ! بھابی کو بیوہ ہونا ہی ہے (بیوہ ہونا ہی ہے بھابی ابھی سے ایسے حالات پیدا کرنے کا جتن کرو کہ بیوگی کے ایام خوشگوار ہوں ـــــ کوشش کرو بھابی ، تو کیا پتہ ، تمھارے وہ دن اِن دنوں سے بھی زیادہ مزے سے کٹیں ، بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ وہ دن بہتر ہی ہوں گے ۔ بھائی صاحب نے پورے پچاس ہزار کا بیمہ کروا رکھا ہے ، مکان تمھارا اپنا ہے ۔ ایک بھائی صاحب نہیں ہوں گے ، پر اور سارے بھی کیا اُن کے ساتھ مر جائیں گے ؟ ـــــ سبھی ہیں ـــــ میں بھی ہوں ـــــ مجھے غلط نہیں سمجھو بھابی (تم سے میں ایک شادی نہیں کروں گا اور جو چاہو گی کروں گا ـــــ بازیچو یوں کریں گے کہ پہلے بیس بائیس برس ہم الگ الگ خوب جی بھر کے جی لیں گے ، پھر جب دونوں بوڑھے ہو جائیں گے تو مرنے سے چند روز پہلے چپکے سے ایک دوسرے سے شادی کر لیں گے ۔ اس کے بعد تم ایک بار پھر بیوہ ہو گئیں تو یقین کرو تمھیں کوئی رنج نہ ہو گا ۔ سوکھے ہوئے وجودوں کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ہیں ـــــ روؤ نہیں بھابی ، دور کی سوچو اور خوش رہو ـــــ بھائی صاحب کے چلے جانے پر ہی تمھاری آئندہ خوشی کا انحصار ہے) ـــــ ارے مکھی ابھی تک یہیں ہے ! ـــــ اس کمرے کو میں نے اپنے دماغ کی طرح سجا رکھا ہے تاکہ دماغ سے نکل کر یہاں آ بیٹھوں تو یہی لگے کہ وہیں ہوں ، ہر شے عین اپنی جگہ پر ہے ، اتنی صاف کہ اُسے دیکھتے ہوئے اُسے دیکھنے کی بجائے اس کی صفائی کی جانب ہی دھیان

جائے ـــــ میرا نوکر صبح و شام باقاعدگی سے قالین میں سے گرد نکالتا ہے۔ فرنیچر کی جھاڑ پھونک کرتا ہے، نادیدہ اجرام کو غائب ہی غائب میں مارنے کے لیے ہیوی کلرز سے فلٹ کرتا ہے، اور گلابوں پر بڑے سلیقے سے رات کی رانی کا سینٹ لگاتا رہتا ہے ـــ اور مجھے لگتا ہے کہ یہ سب کچھ میرے دماغ میں ہی ہو رہا ہے۔ آپ یہاں کہیں غلاظت کا ہلکا سا نشان بھی دکھا دیں تو میں اپنا گلا کاٹ لوں، نہ بھی کاٹوں تو زندگی سے بھرپور بیماریوں کے ان دیکھے ذرات سے میرا گلا آپ ہی آپ گھٹ کر رہ جائے گا ـــــ میں اپنے دماغ میں صبح و شام اس وقت تک فلٹ کرتا ہوں جب تک مجھے یقین نہ ہو جائے کہ سارا ماحول زندگی سے پاک ہو کر کشادہ ہو گیا ہے اور پھر اس محفوظ کشادگی میں رات کی رانی بسنے لگتی ہے۔ میں اپنی کھڑکیوں کے پٹ تو کھلے رکھتا ہوں، لیکن ہر کھڑکی پر میں نے کچھ اس طرح کے بلائینڈ نصب کروا رکھے ہیں کہ باہر کی روشنی اور ہوا چھن چھن کر، نہایت شیک اور بے ضرر ہو کر اندر آئے۔ ہاں، وہ عقب کی کھڑکی ہمیشہ بند رکھتا ہوں کیوں کہ اس طرف بڑی گندی بستی ہے۔ وہاں کے لوگوں کو گندگی کے ڈھیروں میں رہنے کی اتنی عادت پڑ گئی ہے کہ بیماریوں سے مرنے کی بجائے توانا ہو ہو کر بیماریاں پھیلاتے ہیں ـــــ

مکھی اب گلابوں پر منڈلا رہی ہے اور دو چار چکروں میں ہی رات کی رانی کے اینٹی سیپٹک عناصر سے ڈھیلی پڑ کر صوفے کی طرف مڑ گئی ہے جہاں چین سے بیٹھا ہوا صوفہ اپنے دھلے ہوئے بے داغ لباس میں یکلخت سکڑ گیا ہے اور نفرت سے اس نے اپنی سانس روک لی ہے لیکن تا دیر روک نہیں پایا تو خارج ہوتی ہوئی سانس کے جھکڑ میں مکھی سامنے کی دیوار سے جا ٹکرائی ہے اور پھر ذرا سنبھل کر وہیں کیلنڈر کی تاریخوں کے خانوں پر بھن بھن اڑنے لگی ہے۔

آج چودہ تاریخ ہے ـــ ارے ہاں، آج تو ـــ

"بوائے! ـــ ب ـــ!"

"یس سر!"

"آج شام کو چائے پر مہمان آ رہے ہیں۔"

آج شام کو میرا باس اور اس کی بیٹی میرے یہاں آ رہے ہیں۔ میرا باس مجھے اپنی بیٹی کے لیے پھنسا لینا چاہتا ہے اور میں اسے اپنی پروموشن کے لیے۔ خلاف خواہش شادی کر بھی لوں مگر ڈرتا ہوں کہ اس کی بیٹی کھا دسے اتنی لدی پڑی ہے کہ میری چھوٹی موٹی مسکراہٹوں سے بھی درجنوں بچے پیدا کر کے جان وبال کر دے گی۔ ہر وقت منہ ہلاتی رہتی ہے۔ اپنے ناخنوں سے دانت صاف کرتے ہوئے آنکھیں مٹکاتی ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ننگے ہو کر بوائی کر رہا ہوں اور میرے بدن پر سینکڑوں کیڑے کلبلا رہے ہیں۔

"بوائے!"

"یس سر!"

مہمانوں سے کہہ دینا کہ میں گھر میں نہیں ہوں ـــ نہیں، ٹھہرو ـــ کہہ دینا کہ اچانک بھائی کی موت کی خبر پا کر میرا جانا ہو گیا ہے ـــ نہیں، ٹھہرو! ـــ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اسے کیا بتاؤں۔

یرے بڑے بھائی کی حالت آج واقعی غیر ہے لیکن اُس کے مرنے سے پہلے ہی اُس کی موت کی خبر اُڑا دینا عجب نہ ہوگا ۔

"دیکھو کہہ دینا کہ میرے دادا کی موت کی خبر آئی ہے۔" دو ماہ پہلے ہی دادا کی موت کا عذر پیش کر کے میں نے دس دن کی رخصت منظور کروائی تھی ۔

"تمہارے دادا کی عمر کیا تھی ونیشو ؟" باس نے کسی نہایت قریبی رشتہ دار کے مانند اتنے المناک لہجہ میں پوچھا تھا کہ مجھے ڈر ہونے لگا تھا، وہ میرے ساتھ ہی آنے کو تیار نہ ہو جائے ۔

"ساڑھے ستاسی برس"۔ حالانکہ وہ میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی جانے کب مر کھپ گیا تھا۔

"یعنی پورے ساڑھے ستاسی برس ؟" اس نے گویا سوچ رکھا تھا کہ میرے دادا کی عمر میری عمر سے کم ہو گی ——— میں ہنسنے لگا ہوں۔ مجھے خیال آیا ہے کہ ٹھیک ہی تو ہے۔ سب سے بڑا وہی ہوتا ہے جو آخر میں رہ جائے۔ میرا دادا اپنے بڑوں سے بڑا تھا، میرا باپ میرے دادا سے ——— اور میں سب سے بڑا ہوں۔ وہی خون مجھ میں دوڑ رہا ہے نہیں دوڑ نہیں رہا ہے، کہنہ ہو کر اب لاٹھی کے سہارے آہستہ آہستہ میری رگوں میں چلتا ہے ——— اور چلتا ہے، تو رگوں میں لاٹھی کی پیہم رگڑ سے میری جان ہر لحظہ منہ میں اٹکی رہتی ہے ——— میرے بزرگو، آہستہ چلو ——— اور آہستہ ——— تم سب جوان ہو بزرگو، لیکن میں اپنی اس عمر میں بھی تمہارے ساتھ ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔ تمہاری تیز روی باعثِ رشک ہے لیکن مجھ بڈھے کو اکیلا چھوڑ کر آگے مت بڑھو ——— آہستہ چلو عزیزو! ——— نہیں ؟ ——— نہ سہی! میرے لیے تم اپنا مزہ کیوں کرکرا کرو ؟ ——— مر کھپ کے اب کہیں تمہارے ہنسنے کھیلنے کے دن آئے ہیں۔ خوب عیش کرو۔ میرے بزرگو ——— شاباش! آگے بڑھ جاؤ ——— جاؤ! ——— نہیں، رک جاؤ۔ دیکھو، میرا بھائی بھی آنکھیں مل رہا ہے، جاگ رہا ہے، آنکھیں کھل لینے دو، دوڑ کے تمہارے ساتھ ہو لے گا ——— جاؤ ——— سب جاؤ! ——— میں تمہارا کیا ہوتا ہوں! جاؤ، مجھے بھی تمہاری کیا پروا ہے ؟ ——— میری موت کے بعد میرے بیمے کی رقم میرے باپ کو ——— نہیں، میری وصیت بدل دو ——— نہیں، ایسے ہی رہنے دو ——— لیکن تمہارا باپ تو مر چکا ہے ——— ارے ہاں، وہ تو مر چکا ہے ——— مر چکا ہے تو اچھا ہی ہے، بڑا نالائق تھا ——— تو میرے بیمے کی رقم ——— ہاں، میرے بیمے کی رقم میرے دادا کو ملے! ——— نہیں ٹھہرو! سب نالائق ہیں! میری ساری اولاد کو میری پروا نہیں تو میں بھی کسی کی پروا کیوں کروں ؟ ——— ہاں، کیوں کروں ——— لکھو، میرے بیمے کی رقم ——— ساری رقم میری موت کے بعد مجھے ہی ملے! میں آپ اپنا جائز وارث ہوں۔ میرا وارث کوئی نہیں ۔ میں بے اولاد ہوں ——— اپنی صحت کی خاطر خون کو صاف کر کر کے میں نے لمبے زندگی کے ایک ایک جرم سے پاک کر لیا ہے ——— نہیں، ونیشو، آپ کے میرا بچہ تمہارا ہی ہوگا ——— نہیں بھائی، تمھیں یاد نہیں ہوگا کہ تمہارا وقت کس کے ساتھ کٹا۔ میرا باپ بے اولاد تھا

میں ــــ مجھے یقین ہے کہ میں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ تم سمجھتی ہو کہ میں ہوں ــــ نہیں بھابی، میں نہیں ہوں، میرا باپ بھی نہیں تھا، ہماری سارے خاندان میں کوئی بھی نہیں تھا۔ تم اپنی بیوگی کا انتظار کر رہی ہو بھابی، لیکن اصلیت یہ ہے کہ میرے بھائی سے شادی کرتے ہی تم بیوہ ہو گئیں، ہم سب کی طرح وہ بھی کبھی نہ تھا ــــ

میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔ مکھی بھنبھنا رہی ہے، نہ جانے میرے دماغ میں، یا کلینڈر پر تاریخوں کے خانوں میں ــــ ہاں، ابھی تک وہیں ہے اور چودہ تاریخ کے خانے میں گھسنا چاہ رہی ہے اور ہر بار کاغذ سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہے ــــ میں بھی ہر روز کے مانند آج کے دن میں گھسنا چاہ رہا ہوں مگر آج بھی بدستور کواڑ بند ہیں، آج بھی یونہی آج کے باہر رہ جاؤں گا ــــ

"بوائے!"

"یس سر!"

"مہمانوں سے بس اتنا ہی کہہ دینا کہ میں کہیں باہر ہوں۔"

یہ حقیقت ہے کہ میں ہمیشہ باہر ہوتا ہوں۔ مجھ سے کئی لوگ ملنے آئے ہیں پر پتہ نہیں کس سے مل کر چلے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ اچانک میرا باہر سے اندر آنا ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ میری بجائے کوئی اور میری محبوبہ روبینہ کے پہلو میں لیٹا ہوا ہے۔ میں اپنے دماغ کی کسی رگ میں چھپ کر بیٹھا تھا اور اُن کی طرف گھور گھور کر دیکھے جا رہا تھا ــــ ڈارلنگ! ــــ روبینہ اس شخص کے کانوں میں دھیرے دھیرے ہنسنے کے انداز میں بول رہی تھی ــــ تم ان عورتوں کے پیچھے لگے رہتے ہو لیکن ــــ میں ــــ میں صرف تمہاری ہوں ــــ روبینہ نے اس سے پہلے کئی بار مجھ سے بھی یہی کہا تھا ــــ تو پھر یہ کون ہے؟ ــــ پہچانو، کون ہے؟ ــــ اسے دیکھ کر مجھے غصہ کیوں نہیں آ رہا ہے؟ ــــ میرے ہی گھر میں ــــ میرے ہی بدن میں میری محبوبہ کے پہلو میں چین سے لیٹا ہوا ہے ــــ میری ہی محبوبہ پر قبضہ جمائے ہوئے ہے پھر بھی مجھے غصہ نہیں آ رہا ــــ میں نے اُس کی زبان سے ــــ اپنی زبان سے جس پر وہ قابض تھا بول کر اسے مخاطب کرنا چاہا ــــ سنو! ــــ اور وہ جوں کا توں بول رہا ہے ــــ سنو! ــــ لو سُن لو۔ سننا چاہتے ہو تو آپ ہی اپنی سُن لو ــــ کون ہو تم؟ کہاں سے آئے ہو؟ ــــ وہ عین اُسی وقت گویا ہوا جب میں ــــ میں ہنس دیا اور اسی وقت وہ بھی ــــ اور پھر روبینہ اس کی طرف منہ پھیر کر اُس سے بے اختیار پیار کرنے لگی ــــ کس سے پیار کر رہی ہے؟ ــــ مجھ سے کر رہی ہے تو کس سے کر رہی ہے؟ ــــ میں نے اپنی ہنسی کو روکنے کی ناکام کوشش کی ــــ بڑے خوش نظر آ رہے ہو ڈیشو! ــــ ہاں، روبی، میں بہت خوش ہوں کیونکہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے برے اچھے یا برے کلام کی ذمہ داری میری نہیں ــــ ہاں، روبی، اگر اس وقت میں تمہارا گلا گھونٹ دوں تو بھی میں نہایت ایمانداری سے کورٹ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں معصوم ہوں ــــ

روبینہ میری طرف بغور دیکھتے ہوئے اچانک ٹھٹک کر رہ گئی اور پھر بستر سے اٹھ کر جلدی جلدی کپڑے پہننے لگی روبی! ـــ روبی! ـــ میں نے اٹھ کر اُسے اپنے بازوؤں میں لے لینا چاہا لیکن وہ میرے بازو سنبھالے مزے سے لیٹا رہا ـــ روبی! ـــ میں اپنے جسم کے بغیر اُسے کیونکر روک سکتا تھا؟ ـــ قدرت بڑی کارساز ہے، موت کی واردات پر درد کی گانٹھیں ایک ایک کھلتی چلی جاتی ہیں ـــ نہیں! ـــ اس انجانے لذت کوش عمل سے خوف زدہ ہوکر بیمار گانٹھوں کو کھلتے جانے سے روک لینا چاہتا ہے ـــ نہیں! ـــ لیکن اب تک ساری گانٹھیں کھل چکی ہیں اور مرنے والے کو سارے کا سارا مر کر چین آ گیا ہے ـــ نہیں! ـــ ارے، وہ تو ابھی جوں کا توں زندہ ہے اپنی موت کے بعد بھی اُسے ابھی مرنا ہے! ـــ روبی! روبی! ـــ میرے درد کی گانٹھیں ـــ میرا جسم ہی نہیں رہا تو میرے درد کی گانٹھیں کہاں بندھی ہوئی ہیں ـــ یا شاید ـــ شاید اسی کیفیت کا نام جہنم ہے!ـــ

مکھی کیلنڈر پر تاریخوں کے خانوں سے نکل آئی ہے اور کاغذ کی خالی سطح پر بھی اُسی بے صبر سرعت سے بھنبھنائے جارہی ہے اور اُسے معلوم نہیں کہ وقت کے سارے خانے پیچھے رہ گئے ہیں ـــ اب اتنی بے چینی کیوں! اب تو کہیں آرام سے ٹک جاؤ ـــ لیکن کہیں زندگی کے آثار ہوں تو ٹک بھی جائے۔ یہاں بھی وہاں کے مانند صفائی ہی صفائی ہے، جہاں گندگی کا یہ چھوٹا سا جاندار لوتھڑا اپنے پیروں کو سمیٹ لے تو بیمار پڑ جائے۔ مجھے اُس پر ترس آنے لگا ہے، نا معلوم اُسے آرام سے بیٹھنا کہاں نصیب ہوگا۔

میں نے کمرے کی چاروں طرف نگاہ دوڑائی ہے اور عادتاً مجھے بڑے اطمینان کا احساس ہوا ہے کہ میرا یہ ملاقاتیوں کا کمرہ نہایت جھاڑا پونچھا ہوا ہے، اتنا کہ یہاں کسی رستے کا نشان بھی ملنا ناممکن ہے۔ اس قدر صاف و ہموار ماحول میں کوئی تا دیر قیام نہیں کرتا۔ بس آئے اور گئے ـــ میں اپنے ہر ملاقاتی کو اس باہری کمرے تک ہی آنے دیتا ہوں۔ میری اندر کی رہائش صرف میری ہے۔ اپنے اندر کوئی کسی کا خیال ہی لے جا سکتا ہے، یا پھر یہ ہے کہ اُسے کاٹ کے، اُبال کے کھا لیا جائے اور خوراک کے حیاتیات کو جذب کر کے فضلا خارج کر دیا جائے۔ دوسروں کو چھوڑیے، میں اپنی بھابی کو بھی یہاں سے آگے اندر کی طرف نہیں جانے دیتا۔ وہ بڑی اپنائیت سے اندر گھستے چلے آنے کے انداز میں وارد ہوتی ہے مگر میں نہایت ملائمت سے اُسے یہیں روک لیتا ہوں۔ ایک بڑا سا پلنگ بھی میں نے یہیں بچھوا رکھا ہے۔ جو کچھ بھی کرنا ہو کر لو، لیکن بس یہیں تک۔

لیکن بھابی آج صبح سویرے ہی آدھمکی اور اصرار کرنے لگی کہ پہلے مجھے اندر لے جاؤ۔

"خیر تو ہے بھابی؟ ـــ بیٹھو ـــ"

"سدا یہیں بٹھا دیتے ہو، مگر یاد رکھو اپنے اندر نہ لے گئے تو میں خودکشی کرلوں گی۔"

"آرام سے بیٹھو بھابی، اتنی پریشان کیوں نظر آرہی ہو؟"

"تمہارے بھائی کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

میں چونکا لیکن بس اس قدر، کہ چونکا نہ ہوں۔

بھابی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری پڑی تھیں — جیسے بڑے دکھ سے پوچھ رہی ہوں، مرنے والا تو مر ہی رہا ہے، لیکن یہ بتاؤ، اُس کے مرنے کے دو، چار۔ یا دس ماہ بعد مجھ سے شادی کرو گے؟ — وہ اپنے ابھرے ہوئے پیٹ پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے تھی، شاید یہ سوچ کر کہ نہ رکھے ہوئے ہو تو میں بھول جاؤں گا کہ وہ تیرے بچے کی ماں بننے جا رہی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ بھابی مجھے پسند نہیں۔ سینکڑوں میں ایک ہے۔ اس وقت اُسے امنڈی امنڈی گھٹا کی طرح برسنے کو پاکر میرا جی چاہ رہا ہے کہ جلدی جلدی سارے کپڑے اُتار دوں اور جی بھر کے نہا لوں مگر موسلا دھار بارش بھی ہونے لگے تو نہائی تو صرف ہماری باہری جلد ہی ہے — یہ بھی چھوڑیے، اب یہ کہ اپنے اندر ہی اندر نہا لینے سے بھی مسام نہیں کھلتے کہ اندر کی غلاظت خارج ہوتی رہے۔ میں اپنی صفائی پسندی کا چرچا کرتا رہتا ہوں مگر سچ یہ ہے کہ میں اسی لیے کسی کو اندر نہیں لے جاتا ہوں کہ مرے اندر غلاظت ہی غلاظت ہے۔ میں گویا اسی غلاظت کو صاف کرنے کی کوشش میں باہری صفائی میں جٹا رہتا ہوں؟ بلاناغہ نہایت محنت سے مل مل کے نہاتا ہوں، پھر تولیا رگڑ رگڑ کر بدن کا انگ انگ پونچھتا ہوں، پھر بدن پر ڈھیروں پاؤڈر چھڑک کر اُجلے دھلے ہوئے کپڑے پہن لیتا ہوں — آؤ بھابی، مل لو — مگر بھابی میرے اندر جا کے میری غلاظت کو کریدنا چاہتی ہے۔ میں اُسے اس کی اجازت کیوں دوں؟ نیچر کے کام میں کیوں مخل ہوتے دوں؟ اُسے کیوں اپنے اندر داخل ہونے دوں؟

"بیٹھو بھابی۔ گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نہیں، وشو، میں — اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو میں لُٹ جاؤں گی۔"

وہی دو چار یا دس ماہ والی بات، گویا کہہ رہی ہو، تمہارا بھائی تو مر ہی رہا ہے، بولو، مجھ سے شادی کرو گے؟

میں کیا بولوں؟ — ارے بھئی، موٹی انشورنس ملے گی، اتنا بڑا مکان تمہارا اپنا ہے۔ تمہارے (اپنے) دوسرے بچے کی تربیت کا سارا خرچ میں اپنے ذمے لے لوں گا، اس سے زیادہ کسی کو اور کیا چاہیے؟

مجھے کچھ اور نہیں چاہیے، وشو۔ میں بس ایک تم ہی کو چاہتی ہوں — بولو!

مجھ کی جھنجھلاہٹ تیز تر ہو گئی ہے۔ باہر جانے کا کوئی راستہ اُسے سوجھ نہیں رہا ہے اور یہاں کوئی ایسا غلیظ مقام نہیں جہاں وہ آرام سے بیٹھ جائے۔

"یہیں پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔ بھابی"

وہ بیٹھ گئی تو اس کی لٹکتی ٹانگوں کو اوپر پلنگ پر ٹکا کر میں نے اسے لٹا دیا۔

"تم بہت پریشان نظر آ رہی ہو"

اُس کی آنکھوں کی بھیگی بھیگی تابندگی دیکھ کر مجھے لگا کہ گجردم ابر سے جھانکتی ہوئی تاروں کی خنک جھلملاہٹ میری نظر میں بھرنے لگی ہے ـــــ میں بھی اس کے ساتھ لیٹ گیا اور میرا جی چاہنے لگا کہ بے اختیار اس کے دکھ میں اتر جاؤں ـــــ وہ رو رہی تھی ـــــ روؤ نہیں بھابی! ـــــ لیکن میری خواہش تھی کہ وہ روتی رہے۔ عورت کے رونے سے مجھے اس کی مکمل آمادگی کا سراغ مل جاتا ہے اور میں خوب سیر ہو کے کھا پی لیتا ہوں۔ ورنہ ہشاش بشاش عورتوں کی رفاقت میں تو بس یہی محسوس ہوتا ہے کہ انھیں ذرا سا چکھ لیا ہے اور چکھ کے بھوک بھڑک اٹھی ہے۔ مگر کھانے پینے کو باقی کچھ بھی نہیں ـــــ میں نے خوب سیر ہو کر کھا پی لیا تو بھابی اچانک بڑبڑا کر اٹھی "تمہارے بھائی کی حالت غیر ہے"

"ہاں، تم چلو، میں بھی تھوڑی دیر میں آجاؤں گا"

لیکن مجھے موت کے کہیں آس پاس ہونے کے احساس سے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ اندھا دھندا ہی ہوتی ہے، کون جانے بیمار کے ساتھ کسی اور کو بھی ہانک لے جائے۔ سو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر میرے بھائی کو آج ہی مرنا ہے تو میں اس کی موت کا انتظار کر کے ہی جاؤں گا، شاید بھابی بھی آکر اس لئے تھوڑی دیر اطمینان سے یہ سمجھ کر لیٹ گئی کہ اس دوران اپنے شوہر کی موت کی خبر آسے موصول نہ ہو گی ـــــ وہ اُس گھڑی سے گھبرا رہی ہو گی جب موت اُس کے شوہر کی آنکھوں سے جھانک کر اُس سے کہے گی ـــــ سنو! جانتی ہو، میں کون ہوں؟ ـــــ اور وہ اس کی طرف دھیان سے دیکھ دیکھ کر بوکھلا جائے گی ـــــ یہ تو ـــــ یہ تو میں ہی ہوں ـــــ ہاں، مجھے یقین ہے کہ جب میرے بھائی کو موت پیش آئے گی تو دراصل اسے بھابی ہی پیش آئے گی۔ میرا بھائی۔ مجھے بخوبی علم ہے۔ بھابی سے بے انتہا پیار کرتا ہے اور اسی فکر میں مرا جا رہا ہے کہ اس کی موت کے بعد بھابی کا کیسا ہو گا ـــــ لیکن اس کے ہوتے ہوئے بھابی کا کیا ہو رہا ہے؟ بھابی کو اس کے جانے کا دکھ تو ہو گا ہی، لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کے جاتے ہی بھابی سکھ کا سانس بھی لے گی ـــــ یہ جان لیوا انتظار کی گھڑی آخر بیت گئی ـــــ آؤ راجو کھانا کھا لو اور آرام سے سو جاؤ، صبح تمہیں اسکول جانا ہے ـــــ اور مجھے ـــــ مجھے اب کیا کرنا ہے؟ ـــــ بھابی اپنے آپ سے پوچھے گی ـــــ مجھے اپنے شوہر کے بیمے کی رقم وصول کرنا ہے، دلشو کا بچہ جننا ہے اور پھر چند ماہ بعد دلشو سے شادی کرنا ہے ـــــ نہ بابا، نہ! میں اس سے شادی کیوں کروں؟ اگر موت اسی کا نام ہے کہ ہم اپنوں کی فکر کر کر کے دم توڑ دیں تو میں کسی کو اپنا کیوں بناؤں؟ مجھے ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ جہنم ہی سہی لیکن جہنم بھی لازوال ہوتا ہے ـــــ

بھابی کے جانے کے بعد میں نے سویرے سویرے ہی وسکی کے ایک ـــــ دو ـــــ تین ڈبل ڈاٹ چڑھا لیے اور لیٹے اس فیصلے پر اَڑ گیا کہ میں یہیں اپنے بھائی کی موت کا انتظار کروں گا ـــــ شاید ـــــ شاید وہ آپ ہی اپنی موت کی خبر لے کر آجائے ـــــ دلشو، میرے انتم سے پرتم موجود نہ تھے۔ میں نے سوچا تم سے مل کر جاؤں! ـــــ آئیے،

بھائی صاحب، بیٹھیے، آپ کیلئے چائے منگواؤں؟ ـــــ نہیں دودھ منگواتا ہوں، چائے ڈاکٹر نے منع کر رکھی ہے۔ مکھی اپنے لئے کوئی غلیظ ٹھکانہ نہ پاکر اب بھنا گئی ہے اور ادھر اُدھر بھن بھن اُڑنے لگی ہے اور میری نظریں ویسے ہی اُس کے ساتھ ساتھ ـــــ یہاں ـــــ وہاں ـــــ وہاں ـــــ پھر یہاں ـــــ میری آنکھیں پپوٹوں سمیت اپنی جگہ سے اُکھڑ گئی ہیں ـــــ یہاں ـــــ وہاں ـــــ میں اپنے بھائی کی موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ ـــــ یہاں ـــــ میرا دماغ نشے سے گرانبار ہوتا جا رہا ہے ـــــ وہاں ـــــ شاید مجھے قے ہونے جا رہی ہے ـــــ ہاں، میری غلاظت اچھل کر باہر آجائے تو شاید مجھے چین محسوس ہونے لگے ـــــ وہاں ـــــ بھائی صاحب آپ نے کیوں زحمت کی؟ میں اُدھر آ ہی رہا تھا ـــــ ابھی نے سوچا دیکھو، تم سے مل کے جاؤں ـــــ یہاں، میری طرف ـــــ میرا منہ کھلا ہوا ہے اور ـــــ ار ـ ر ـ ر! مکھی میرے منہ میں داخل ہو کر حلق سے نیچے اُتر گئی ہے!



ہَرامبے

کیوں ری باؤلی، بس اتنے میں ہی لوٹنے پوٹنے لگیں ؟ ٹھیک ہے بابا، درد ہے تو اپنے ہی وجود کا تو ہے، باہر سے کسی تیر نے دانت تو نہیں گاڑ دیے ؛ موئنگو٭ کا شکر ادا کرو ناشکری، ورنہ شیر کے پیٹ میں پڑے لوٹنا بھی نصیب نہ ہوتا ــــ صبر سے کام لو۔ مورکھ ــ نہیں، صبر سے کام لے سکتیں تو ہرنی کی ہرنی کیوں کر رہ جاتیں، پوری عورت کیوں نہ بن جاتیں ؟ تم نے میری واناواکھے٭ کو تو دیکھا ہی ہے۔ جان بھی نکل رہی ہو تو مسکان ویسی کی ویسی چہرے پر ٹھہری رہتی ہے، ہاں، چہرے سے دل تک اتر کر اس طرح اس کے اندر ہی جڑی ہوتی ہے کہ ہزار تکلیف میں بھی، کیا مجال، ذرا سی ہل جائے۔ تکلیف ہی تو ہے گزر جائے گی ــــ اپنی واناواکھے پر مجھے بڑا پیار آتا ہے ــــ نہیں، آتا ہے کیا ؛ کہیں باہر تھوڑا ہی جاتا ہے کہ لوٹ آئے گا ! میرے پیار نے تو میرے گھر میں ہی ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ پل بھر کے لیے بھی باہر قدم نہیں رکھتا۔ دہلیز سے باہر صرف مجھے ہی کام دام پر جانا ہوتا ہے۔ اور میرا پیار ہر دم وہیں میری واناواکھے کے آس پاس منڈلاتا رہتا ہے ــــ

اری باؤلی، چین سے میری بات تو سنو۔ میں اتنی محبت سے تمہیں اپنی واناواکھے کی بات سنا رہا ہوں پر تمہارا لوٹنا پوٹنا تھمنے میں نہیں آرہا ــــ اگر میں تمہارا ہرنا ہوتا تو اپنا مردوں والا ایک سینگ مار کر ہی تمہیں سیدھا کر دیتا۔ تمہارا ہرنا ہرنا ہی نہیں۔ ہوتا تو تمہاری کیا ہمت، کہ اس وقت اپنی چاروں ٹانگوں پر چپ چاپ کھڑی نہ ہوتیں۔ ایک تم ہی ماں بننے نہیں جا رہی ہو، میری واناواکھے بھی ایک درجن سے زیادہ بچے جن چکی ہے۔ میرا بچہ کسی پتھریلے ٹیلے کی طرح

٭ افریقیوں کا ایک نعرہ جس کا مطلب ہے آؤ مل کر زور لگائیں اور دکھوں کو باہم بانٹ کر نجات حاصل کرلیں۔ سہیلی کا لفظ ہے۔

ں کی کوکھ سے نیچے لڑھک رہا ہوتا ہے پر اس کی مسکان ـــــ وہ ـــــ اس پہاڑی سبزے کی طرح ٹس سے مس نہیں ہوتی ـــــ ہاں پتھریلے ٹیلوں کی رگڑ سے پسلیوں پر چوٹ تو آتی ہے پر چوٹ بھر بھی جاتی ہے چنگی، اور بھر جاتی ہے تو نئی نوبلی بھی تو نکل آتی ہو ـــــ کبھی کبھی تو اسی لیے میں اپنی وانا واکھے کو پیٹ بھی لیتا ہوں اور اس کے بعد وہ اتنی پیاری لگتی ہے کہ جی چاہتا ہے اس کی چوٹوں کو چوم چوم کر پھول بنا دوں ـــــ میری وانا واکھے کی مٹی بڑی زرخیز ہے رہی۔ ذرا سا سیراب کرو تو پھول ہی پھول اُگ آتے ہیں۔ ان کی خوشبو سونگھتے چلے جانے کے لیے میں اس کے اندر ہی اندر ـــــ اندر ہی اندر اترتا چلا جاتا ہوں۔ میں اس سے اتنا پیار کرتا ہوں کہ ـــــ کہ مجھے ڈر سا لگنے لگتا ہے، وہ مر گئی تو میں کیا کروں گا۔ میں اسے گلے لگاتا ہوں تو وہ میرا سارا درد چوس لیتی ہے اور چوس کر بھی ویسے ہی مسکراتی رہتی ہے ـــــ اری! میں اسے سمجھاتا ہوں درد زیادہ ہو رہا ہے تو جلدی سے تھوڑا رو لو، نہیں تو اسی طرح مسکراتی مسکراتی مر گئیں تو مجھے پتہ بھی نہ چلے گا کہ مر گئی ہو ـــــ بس مجھے یہی خطرہ لگا رہتا ہے کہ میری وانا واکھے کی مسکان مجھے دھوکا نہ دے جائے۔ کانٹا چبھ جائے تو سسکی سے بھی باہر کی طرف اچھلتا ہے، لیکن سسکی نکلنے میں ہی نہ آئے تو جان نکلتی ہے نہ چین آتا ہے ـــــ اری بے وقوف، چین نہیں آ رہا ہے تو اسی طرح تڑپتی ہوئی اس جھیل کے کھڑے پانی میں جا کودو۔ جینے جنے کا حوصلہ نہیں تو جان کو کیوں سنبھالے ہوئے ہو؟ ـــــ بڑی ماں بننے جا رہی ہو۔ دھرتی ذرا سی پھٹے بھی نہیں تو بیج پھوٹ کر باہر کیسے آئے؟ ـــــ ذرا صبر سے کام لو نادان۔ پہلے تو اپنے ہرنے کی ٹانگوں میں بے صبری سے گھسی پڑی رہتی تھی۔ اور اب کھا پی کے پیٹ پھول گیا ہے تو یہ تھوڑا سا دکھ سہنے کا دم نہیں ـــــ چلو تھوڑا نہ سہی، ذرا زیادہ ہی سہی، پر ہے تو اتنا ہی، جتنا ہے، اس سے زیادہ تو نہیں۔ جتنا بھوگا ہے پاگلی، اس سے آدھا بھی نہ بھوگی تو تمہاں پھل کیسے لگے گا ـــــ وہ آم کا پیڑ دیکھ رہی ہو؟ اری چینخنا بند کرو اور وہ ـــــ وہ دیکھو۔ آم کا وہ پیڑ۔ دیکھو اس کے بھی بور پھوٹ رہا ہے۔ پھل آتے آتے ابھی ایک ڈیڑھ ماہ اور لگ جائے گا۔ اسے بھی تم سے کم درد نہیں ہو رہا ہوگا۔ لیکن دیکھو کیسے خاموش کھڑا ہے! اس کے پھل میں اسی لیے شہد گھلا ہوتا ہے کہ تمہاری طرح چلا چلا کر اپنے درد کا نہار نہیں کھڑا کر لیتا، بلکہ بڑے اطمینان سے اپنے سارے درد کو اپنے ہی باطن میں سمیٹ کر اپنی نجات کا انتظار کرتا رہتا ہے کھڑے کھڑے۔ انتظار کرتا رہتا ہے اور اس لگن اور سہن کے پھل میں موسم آنے پر اس کے وجود پر جا بجا رنگ بیگے آم لٹکنے لگتے ہیں، جیسے صحت ور بچوں کے ڈھیر کے ڈھیر اپنی ایک ہی ماں کے ان گنت تھنوں سے منہ لگائے ہوئے ہوں ـــــ دیکھو رونا دھونا بہت ہو لیا۔ اُدھر دیکھو، وہ جھاڑیاں سرگوشیوں میں تمہارا مذاق اڑا رہی ہیں ـــــ وہ ـــــ وہ سب سے چھوٹی جھاڑی تیوں کو منہ میں ٹھونس ٹھونس کر ہنسی روکنا چاہ رہی ہے۔ ہنسی ہی کی تو بات ہے پاگلی تمہیں اپنے ہی حصے کا درد ملا ہے لیکن کیا ناٹک رچا رکھا ہے! ٹانگیں اوپر کر کے خواہ مخواہ چینخے جا رہی ہو۔ پوری چار ٹانگیں مونگو نے بخش رکھی ہیں۔ اس کا شکر ادا کرو اور سیدھی کھڑی ہو جاؤ اور درد سر اٹھانے لگے تو پونچھ ہلا کر بدن کو جھاڑ دو۔ کھڑی ہو جاؤ، نہیں تو وہ کتا آ رہا ہے، اس نے دیکھ لیا تو کائیں

کائیں کرکے سارے جہاں کے کوؤں کو اکٹھا کرے گا۔ بے چاروں کے موٹی عقل ہے، سچ مچ سمجھ لیں گے کہ مری ہو اور اس وقت تک سر پر منڈلاتے رہیں گے جب تک سچ مچ نہ مرجاؤ گی! ـــــ اپنی چاروں ٹانگوں پر جم کر کھڑی ہو جاؤ ـــــ جلدی! ـــــ وہ آرہا ہے! ـــــ شاباش! ـــــ یوں! ـــــ ہرنی ہو تو کیا، ذرا جم کر کھڑی ہوگئی ہو تو شیرنی معلوم ہونے لگی ہو، اب مسکراؤ، میری دانا داکھے کی طرح مسکراؤ۔ شرماؤ نہیں ـــــ میں آدمی کی ذات ہوں، مجھے تم سے کیا لینا دینا ہے بھئی! ـــــ شاباش! ـــــ ذرا اور کھل کے مسکراؤ! تو تمھیں بری نظر سے بچائے اتنی اچھی لگ رہی ہو کہ عورت ہوتیں تو تمہیں بھی گھر میں ڈال لیتا ـــــ میری دانا داکھے بڑی اچھی ہے، بڑی نیک، ذرا سا بھی کھاتی ہے تو بانٹ کر۔ میں تو اتنا بڑا ہوں۔ وہ جھٹ مجھے بانٹ لینے پر راضی ہو جاتی، لو ہرنی آدھا تم کھاؤ اور آدھا میں'۔ اور تم دونوں مجھے کھاتی رہتیں پر تمھارے کھانے کا سارا مزہ مجھے ہی ملتا، ـــــ واہ ـــــ ہ! کتنی خوب صورت لگ رہی ہو! پر کیا فائدہ، نری پری ہرنی ہو، آدھی عورت بھی ہوتیں تو بات بن جاتی ـــــ ارے پھر ـــــ! نہیں، یونہی کھڑی رہو، یا درد اٹھنے لگا ہے تو بیٹھ جاؤ، وہ بھی بیٹھ جائے گا۔ ذرا سی دیر میں سب کچھ اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ بس ہمت نہ چھوڑو۔ سبھی جاندار تھوڑے تھوڑے دکھی ضرور ہوتے ہیں۔ ہر کسی کو اپنے حصّے کا ہی دکھ ملتا ہے، زیادہ نہ تھوڑا، اور جو ہمت والے ہوتے ہیں وہ اپنے دکھ کو بڑے سکھ سے ٹال جاتے ہیں۔ اب میری دانا داکھے تمھیں اتنی سکھی معلوم ہوتی ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو اسے کوئی دکھ نہیں! اس کی جھگڑالو بہو اس کے آنکھوں کے عین سامنے اس کے کبرو جوان بیٹے کو ہانک لے گئی اور وہ دیکھتی رہ گئی۔ بہو نے اسے اتنا بھی موقع نہ دیا کہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو جی بھر کے دیکھ ہی لے۔ تمھارا خیال ہے ماں کے دل پر آنسوؤں کی دھار نہ پھوٹ پڑی ہوگی پر آفرین ہے میری دانا داکھے پر، اس نے اپنی میٹھی مسکان کو پھیکا نہ پڑنے دیا ـــــ ہاں، جتنا اذیت ناک ہے پر جتنے ہوئے بچھڑنے پر مجبور ہو جانا اس سے بھی اذیت ناک ہے، لیکن ہمیں اپنا اپنا دکھ قبول کرنا ہی ہوتا ہے، رو کے بھی، ہنس کے بھی، پھر رونا آئے بھی، تو جلدی جلدی رو دھو کے کیوں نہ آدمی ہنس بھی لے، دکھ بھی بنا رہا اور سکھ بھی ـــــ دیکھو، پھر بھاگڑ مچانا شروع کیا تو تمھیں اسی حالت میں چھوڑ کر اپنی راہ ہولوں گا۔ اپنے اتنے سے دکھ پر دکھی ہو! مونگو نے تھوڑا تھوڑا دکھ سبھی جانداروں میں بانٹ دیا ہے تاکہ سبھی سکھی رہیں ـــــ لیکن ٹھہرو، پہلے میں تمہیں ایک سچی کہانی سناتا ہوں ـــــ دادا کی کہانی ـــــ وہ ـــــ سب پہاڑوں کے پیچھے وہ ـــــ سب سے اونچا پہاڑ دیکھ رہی ہو نا! ـــــ وہی ہمارا دادا ہے۔ میرا مضے لے مجھے بتایا کرتا تھا کہ آج سے سینکڑوں برس پہلے ـــــ نہ جانے کب ـــــ کئی دن دادا کے کلیجے سے آگ اور لاوے کے دریا پھوٹا کرتے تھے اور آس پاس کی ساری بستیاں دیکھتے ہی دیکھتے اجڑ بجڑ جاتی تھیں ـــــ کان دھر کے سنو گی تو تمہیں قرار آجائے گا پگلی ـــــ ہوا یہ تھا کہ مونگو نے سارے کا سارا دکھ دادا کے سینے میں جمع کر رکھا تھا ـــــ اب دادا اتنا بڑا ـــــ سب سے

لے بزرگ، باپ

بڑا پہاڑ ہے پر کل جہاں کا دکھ ایک ہی سینے میں کیسے سما سکتا ہے؟ دادا کی دھجیاں اڑ جائیں اور لوگوں کو پتہ بھی نہ چلے کہ کب ان کی جانیں نکل گئیں۔ اری میری کہانی پوری ہو لینے دو پھر جی بھر کے چلاّ لینا ـــــ منگو کو آخر یہ ترکیب سوجھی کہ دادا کا دکھ ہم سب انسانوں، جانوروں، پرندوں۔ درختوں ـــــ سب ذی جانوں میں بانٹ دیا جائے ـــــ سنا باؤلی؟ ہم اپنا اپنا دکھ قبول نہ کریں گے تو جیتے جی مر جائیں گے۔ دادا کا سینہ تو بہت بڑا ہے، لیکن سارے جہاں کا دکھ جب ایک ہی سینے میں کلبلانے لگتا ہے تو اتنے بڑے پہاڑ کو بھی اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔ اور ـــــ اور دادا بے قابو ہو جائے تو تیری میری ننھی منی جانیں کیوں کر سلامت رہ سکتی ہیں؟ ـــــ سو بھی ننھی منی جانوں کے لیے اپنے ننھے منے دکھ ہنسی خوشی سہہ لینے میں ہی منگو کی برکتیں ہیں ـــــ اور مورکھ منگو کی برکتوں کو قبول نہ کرنا کتنا بڑا گناہ ہے!۔ ذرا سوچو اس کی برکتیں نہ ہوں تو ہم ایک پل بھی زندہ رہ سکتے ہیں؟ ـــــ ارے! تمہارا منا سا ہرنا آدھے سے زیادہ تمہارے بدن سے باہر آ بھی پہنچا ہے مگر اپنی باتوں کے دھیان میں مجھے دکھائی ہی نہیں دیا۔ سہج سہج مینی!۔ گھبراؤ نہیں، اور سہج! ـــــ ہائے کتنا خوب صورت ہے! ـــــ شاباش!۔ لو، اب پورے کا پورا باہر آ گیا ہے!۔ ہائے! بڑا خوب صورت ہے۔ میرے بچوں کے ڈھیر میں ایک بھی ایسا نہیں جیسا تمہارے ہرنے کا یہ بچہ! میرا جی چاہ رہا ہے میں ہی تمہارا ہرنا ہوتا۔ تمہارا ہرنا بڑا خوش قسمت ہے ری جو تم نے اس کا اتنا پیارا بچہ جنا ہے۔ اتنا پیارا ہے کہ میرا بھی دل چاہ رہا ہے کہ تمہارے ساتھ ساتھ اسے چاٹنا شروع کر دوں۔ نہیں، رکو نہیں، چاٹتی جاؤ۔ ہر بچہ اسی لیے فرشتہ سا لگتا ہے کہ اس کی ماں اسے چاٹ چاٹ کر فرشتوں کی شبیہہ دے دیتی ہے۔ اور چاٹو! ـــــ رک کیوں گئیں؟ چاٹتی جاؤ ـــــ اب تو چین آ گیا ہے نا؟ ـــــ خوامخواہ مری جا رہی تھی۔ دیکھو، منگو کتنا مہربان ہے! اسے یہی فکر رہتی ہے کہ سارا دکھ ایک ہی سینے میں جمع نہ ہوتا جائے ـــــ دیکھو نا، تمہاری تکلیف ذرا بڑھ گئی تو تمہارا یہ ننھا ہرنا اسے بانٹ کر تمہارے وجود سے الگ ہو گیا اور تمہیں چین آ گیا ـــــ سن رہی ہو ری؟ ہم بھی اسی لیے پیدا ہوتے ہیں کہ سنسار کے دکھ بٹتے رہیں، نہ بٹیں تو یقین مانو ماؤں کے بچے پیدا ہونے بند ہو جائیں!۔

ربط کا انعقاد

(یہ چٹھی آج کی ڈاک سے مجھے واپس مل گئی ہے)

—— رامائن!

جب میں نے اس چٹھی کو لکھنا شروع کیا تو جھلا گیا تھا کہ رامائن کو واقعی کیسے مخاطب کروں۔ پیاری رامائن!
— جو شخص اپنی محبوبہ سے خفا ہو ہو کر اسے اتنے پیار سے بلاتا ہے وہ نابالغ ہوتا ہے یا تاجر یا نامرد —— پر کیا میں
واقعی رامائن سے خفا تھا؟ اس سے اپنی خفگی کے احساس سے مجھے ڈر سا محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں مجھے اس سے
عشق تو نہیں ہو گیا۔ نہیں —— میں تو اپنی ہر محبوبہ کو اس لیے رامائن سمجھتا ہوں کہ اس کی ذات سے رام ہی کی کہانی
بیان ہوتی ہے (میرا نام رام ہے) دراصل مجھے اپنے سوا کسی سے عشق نہیں۔ میں شاید یوں ہی اس سے ذرا خفا ہوں۔
یہ بات —— یہی بہ —— ! رامائن مجھے ناراض پاکر ہمیشہ ہنس دیتی ہے تم مجھ سے ناراض ہو جاتے ہو رام تو مجھے بڑے
اچھے لگتے ہو، بڑے بے ضرر، چھوٹے سے! اور میرا جی چاہتا ہے تمہیں پیار سے گود میں اٹھالوں۔

رامائن! میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ مجھے تم سے کیا کہنا ہے اگر مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا ہے تو میں
یہ چٹھی لکھنے کیوں بیٹھ گیا ہوں؟ کیا ہم واقعی اس لیے ملتے ہیں کہ ہمیں ایک دوسرے سے کچھ کہنا ہوتا ہے؟
انسان ہی ایک جانور ہے جو کچھ کہے بغیر محبت یا نفرت کرنے سے قاصر ہے: مجھے تم سے بہت محبت
ہے، اس لیے آؤ، بہت محبت کریں۔ میں تم سے بے حد نفرت کرتا ہوں، آؤ ایک دوسرے سے بے حد
نفرت کریں۔ الفاظ سے انسانی رشتے کتنے مضحکہ خیز ہو گئے ہیں رامائن! ——————

—————— آدمی بے چارے کو بول بول کر اپنے عمل کو یاد رکھنا پڑتا ہے۔

وہ جو کچھ بولنا چاہتا ہے اسے بولنے سے پہلے بڑی احتیاط سے لکھ لیتا ہے۔ پہلے سوچو، پھر لکھو، پھر بولو اور پھر کرو۔ انسان کے سوا دگر سب جانور کتنے خوش قسمت ہیں کہ اپنے اپنے عمل تک ان کی رسائی براہ راست ہے! منہنانے کی خواہش ہو تو بولے اور لکھے اور سوچے بغیر منہنانا شروع کر دو اور منہنا منہنا کر ہلکے ہو جاؤ۔ گر یم؟ ٹھہرو رامائن، پہلے مجھے سوچ لینے دو کہ مجھے تم سے کیا کہنا ہے۔ کہ — کہ — نامعلوم میں کیا کہنا چاہتا ہوں (وہ دیکھو رامائن — وہ کتیا اس لیے بھونکے جا رہی ہے کہ پڑوس میں رہ سہہ کر بھی وہ ذات کا کتا اپنے بھلے چنگے کالے منہ پر سفیدی مل رہا ہے کہ میری طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اپنے پلے بنانے کے لیے کیا میں دریا پار جا کے کوئی یار ڈھونڈوں؟)

تمھیں شکایت ہوگی رامائن کہ یہ سارا عرصہ میں خاموش کیوں رہا بات یہ ہے کہ تمھیں ہر وقت اپنے سامنے پا کر میں تمھارے وجود سے غافل ہو گیا۔ میرے کمرے کی وہ دیوار ہر دم میرے سامنے کھڑی رہتی ہے اور میری نگاہ اس کے پار ٹکی ہوتی ہے، گویا وہ شیشہ ہو اور باہر کی ساری دنیا اس کے اندر ہو اور اپنے اندر دیوار کا اپنا آپ کہیں نہ ہو۔ رامائن، کئی لوگوں سے مل کر۔ اپنے جیسے پاپولر لوگوں سے مل کر — کیا تمھیں بھی الجھن نہیں ہوتی کہ ان سے مل کر ساری دنیا سے تو مل لیا ہے مگر ان سے ملاقات نہیں ہوئی!

تم سے مل کر مجھے بھی احساس ہوا کہ میں تم سے جدا ہو گیا ہوں — ایک رات۔! اس رات میں تمھارے ساتھ ہی لیٹا ہوا تھا۔ اچانک تمھاری خوابیدہ آواز بڑبڑا اٹھی۔ کہاں ہو رام؟ کہاں چلے گئے ہو؟ رام! را — !

اور میں دراصل تمھارے ساتھ نہ تھا؛ میں ساری دنیا کو پہلو میں لیے پڑا تھا کہ ذہور لذت سے اپنی توانا نفرت کو خارج کر کر کے دنیا کو حاملہ بنا دوں۔

اگر میں تمھارے بچوں کی ماں بن جاؤں رام، تم نے مجھ سے پوچھا تھا۔ تو کیا تم مجھ سے محبت کرنا شروع کر دو گے؟

لیکن رامائن، جسے یہ دعویٰ ہو کہ وہ ساری دنیا سے محبت کرتا ہے، وہ ساری دنیا کو دھوکہ دینا چاہتا ہے اتنے بڑے جھوٹ کی ناپ تول میں تمھارے اور اپنے تعلقات کے چھوٹے سے پیمانے سے کیوں کر کر سکتا تھا؟ اگر مجھے تم ایک ہی کو دھوکہ دینا ہوتا تو میرے نزدیک اپنا یہ لمحاتی عمل کوئی اتنا اہم نہ ہوتا' پر ساری دنیا کو کامیابی سے چکمہ دینے کے لیے پوری عمر درکار ہوتی ہے، یا کسی کو فوری کامیابی نصیب ہو بھی جائے تو اسے عمر بھر نیک بننے کی سزا بھگتنا پڑتی ہے — تمھاری غلط فہمی کے ازالے کے لیے جلدی سے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں رامائن، کہ میرا ایمان اولین نیکی میں تو ہے، کیونکہ اولین نیکی میں بدی بھی شامل ہوتی ہے مگر ثانوی نیکیاں آدمی بیچارے کو بھی ثانوی آدمی بنا دیتی ہیں۔

وہ آدمی بعد میں ہوتا ہے اور نیک پہلے ـــــ نہیں، بلکہ نیک ہو ہو کر اس کے آدمی ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ رامائن، مجھے ہر ایسے اقدام سے جھجک ہوتی ہے جس سے سرے سے 'میرا ہونا' ہی مجھے قابلِ یقین معلوم نہ ہو۔

میں نے اپنے آپ سے پوچھا ہے، بیٹا رام، اگر تم نہ ہوتے تو کیا ہو جاتا؟ اور میں نے اپنے آپ کو جواب دیا ہے، اگر میں نہ ہوتا تو میرا باپ ہوتا۔ اور اگر تمہارا باپ بھی نہ ہوتا تو ـــــ؟ تو اس کا باپ ہوتا ـــ پھر؟ پھر اس کا باپ اور پھر اس کا باپ۔ بہر حال میں نہ ہوتا تو بالآخر کوئی نہ کوئی ہوتا ضرور ـــ ہر شخصی زندگی محض حادثہ ہے صرف بے لاگ زندگی حادثہ نہیں۔

رامائن۔ ڈیر!، ہم ایک دوسرے سے بے لاگ رہ کر ہی اپنے تعلقات کو استوار کر سکتے ہیں۔ تمہیں بھول جاتا ہوں تو مجھے تمہاری یاد آ جاتی ہے، ورنہ تمہیں ہر وقت یاد رکھوں تو تمہیں بھول کر بھی یاد کرنے کی نوبت نہ آئے۔ میں تم سے اس لیے خفا ہوں کہ تم مجھے بھول نہیں پاتیں چلو میری یاد تمہاری ہی صلیب سہی، مجھے اس سے کیا غرض؛ پر یہ کیوں ضروری ٹھہرا رامائن، کہ جس طرح تم میری کمینگی اور کوتاہی پر باور کر چکی ہو، اسی طرح میں بھی انھیں تسلیم کر لوں۔ میں بے ایمان ہوں کسی مجلسی ایمان سے پٹ گیا تو تمہاری کمینگی اور کوتاہی، واقعی مجھے کمینہ اور کوتاہ بنا دیں گی لیکن اپنی بے ایمانی کے مدِنظر مجھے اپنی شرافت اور عظمت سے ترجیحی عشق ہے، نہ کمینگی اور کوتاہی سے ترجیحی تنفر۔ بے لاگ زندگی کی خواہش نے میرے لیے ممکن کر دیا ہے کہ میں بھی انسانی خوؤں سے یکساں بشاشت سے پیش آ سکوں۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی بجائے ایک ایک کو اپنی ٹیڑھ نے جنیئس کی بدولت قابلِ اعتنا سمجھوں

ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ سبھی خوؤں کی ہم وجودیت سے ہی بھرپور زندگی ممکن ہے۔ برائی بذاتِ خود بری نہیں۔ برائی اس وقت بری ہوتی ہے جب ہم اسے غلطی سے اپنی نیکی پر محمول کرنے لگتے ہیں، مثلاً شیطان اپنے کردار کے عین مطابق صرف شیطان ہے اگر وہ اپنا فطری رول انجام دیتا ہے تو اپنے کردار کے عین مطابق تقاضوں کو بجا پورا کرتا ہے۔ رتن، تم نرے وِلن ہو۔ میرے ایک فلم ڈائرکٹر دوست کو اپنی کمپنی کے ولن سے شکایت ہے۔ اتنے برے ہو کر قابلِ یقین ولن معلوم ہی نہیں ہوتے اپنے پارٹ میں کھپ کر پورے ولن دکھائی دینے لگو تو تمہیں پرفیکٹ سینٹ سمجھنا شروع کر دوں۔

لیکن کہیں میں رامائن سے اس لیے تو نہیں چڑ گیا ہوں کہ وہ مجھے اچھا آدمی نہیں سمجھتی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں اپنی اندھی دیانت سے اپنی برائی کو اچھائی سے تعبیر کرنے لگا ہوں۔ رامائن، دیکھو پلیز، میں کتنا اچھا ہوں۔ میں اتنا اچھا ہوں رامائن ڈیر کہ مجھے اپنی شیطنت بھی بھلی لگتی ہے۔ مجھے اپنی عمر بھر کے ریاض کے بعد معلوم ہوا ہے کہ ہر شیطان بہ باطن انسان ہے۔ اور ہر انسان؟ ـــــ بہ باطن شیطان،۔۔۔ کیوں کہ اپنی ذہانت کو بے حسی سے بروئے کار لائے

بغیر اس کی انسانیت کے بے قالب ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ رام ــــ شروع شروع میں رامائن نے مجھ سے کہا تھا۔ اگر تم گرم جوش حماقت سے ساری زندگی میرا پیچھا کرتے رہے تو میں اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش قسمت عورت سمجھوں گی۔ ذہین مردوں کی حماقت سے مجھے عشق ہے۔

احمقوں کی حماقت سے کیوں نہیں، رامائن ؟

کیونکہ ان کی حماقت اپنے آپ کو اتنی دانشمند سمجھتی ہے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک رامائن کو لگا کہ میری ذہانت سے حماقت سرزد ہو رہی ہے اسے مجھ سے والہانہ عشق رہا اور جب میری حماقت سراٹھا کر اسے ذہین معلوم ہونے لگی تو وہ مجھ سے کنارہ کشی کی خواہشمند ہوگئی۔

رامائن ڈیر! ہمارے پڑوس میں ایک احسان احمد ہے۔ مجھ سے کہا کرتا ہے۔ رام میاں، مرد کی عقل مندی اسی میں ہے کہ اس کی من پسند عورت اسے بڑا بے وقوف سمجھے۔

تو جناب، اس اعتبار سے آپ عقلمند ہیں یا بیوقوف ؟

بیوقوف رام میاں، ہر اعتبار سے بے وقوف! ــــ لیکن رامائن، احسان احمد کے جواب کی گھر گرتی خطابت مبہم ہونے کے باوجود یہ ذہن ہے سے مجھے ذہن کی طاعت کسی صورت بھی منظور نہیں جب ذہن طاعت گذار ہو جاتا ہے تو انسان نت نئی سوچ کی اہلیت اور جرارت کھو کر متعین سوچوں کے اسباب اور نتائج پر غور وفکر کرتا رہتا ہے۔

رامائن میرا تمہارا ابھی یہی پرابلم ہے تم چاہتی ہو تمہارے ایک بٹن دبا دینے سے میرا خود کار جسم تمہاری لذت کا سامان کرنے کے لیے اسٹیشن کے پوز میں آجائے۔ تم مجھے بس اتنے سے شعور کی اجازت دینا چاہتی ہو کہ میں بے ادراک رہوں۔ بس اتنا سا عقل مند کہ میری بے وقوفی کی صلاحیت بنی رہے۔

تم نہیں جانتیں، کہ تم میری کل کائنات کو اپنے ایئر کنڈیشنڈ بیڈ روم کے ڈیڑھ سو مربع فٹ کے رقبے کے اندر مقید کر لینا چاہتی ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟

تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو رام ؟

رامائن، تمہارے اس سوال کے جواب کا انحصار دراصل تمہاری ہی سہولت پر ہے موسم سرد ہو تو ٹمپریچر یہاں تک۔ گرم ہو تو یہاں تک۔ بس اتنا کہ تمہارا آرام بنا رہے۔

لیکن میں اتفاق سے بڑا خود سر واقع ہوا ہوں رامائن مجھے تمہارے ڈیڑھ سو مربع فٹ کے ایئر کنڈیشنڈ بیڈ روم میں پڑے رہنا پسند نہیں۔ تمہارا ڈبل بیڈ کوئی ساری کائنات تو نہیں۔

میری خواہش ہے کہ میرا رہنا سہنا باہر کی کھلی کائنات میں ہو اور اس بے کراں گرد و پیش میں میری حدِ نظر ہی دیواروں کا کام دے اور آسمان میری چھت ہو۔

رامائن! میرے جسم کا آٹومیٹک ایرکنڈیشنر ابھی اتنا اچھا ہے کہ سخت سے سخت سردی میں بھی میرا بدن بڑی خوشگوار حدت سے بھرا رہتا ہے، کہ شدید گرما میں بھی اپنے آپ میرے بدن میں خنک بہار چھائی رہتی ہے۔

لیکن رامائن سے جب میری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو میرے بدن کا ایرکنڈیشنر بگڑا ہوا تھا اور میں آنکھیں ...ے اپنے باطن کے درون خانے میں سردی سے ٹھٹھر رہا تھا اور — اور تو اور، میں خود آپ بھی اپنی طرف سے ...دھیان تھا۔ جیسے کسی پالتو اور بیمار جانور کو اس کے مالک نے باہر سڑک کی بھیڑ بھاڑ میں ڈال دیا ہو کہ اپنے آپ ...پ جائے گا لیکن وہ اس انتظار میں زندہ ہو کہ پہلے کوئی میری طرف ایک نظر دیکھ تو لے۔ اور کوئی نہیں تو اتنی بڑی ...ڑک بے توجہی ہی ٹھہر کر اک ذرا متوجہ ہو جائے۔ اور اسی اثنا میں رامائن کہیں سے آنکلی۔

ہیلو بے بی! سردی لگ رہی ہے؟ — یہ لو میرا شال اوڑھ لو۔ اٹھو! اٹھا نہیں جاتا؟ ڈرائیور تجے بی ...و اٹھا کر میری گاڑی میں ڈال دو۔ گھبراؤ نہیں بے بی! میرے بیڈ روم میں پہنچو گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا — اور اس آرٹی فیشل ریسپی رے شن سے میرا سانس چلنا شروع ہوا اور یخ بستہ آنکھیں تشکر سے پگھلی سی ...علوم ہونے لگیں۔

یو آر اے ڈارلنگ کلاؤن، رامائن نے میرے بارے میں رائے ظاہر کی۔ میں نے سن رکھا ہے رام، ...خودکشی کا ارادہ کر کے لوگ تمہارے پاس چلے آتے ہیں کہ تمہاری صحبت میں ہنس ہنس کر خودکشی کرنا بھول جائیں ...ال رامائن، مگر تم سے مل کر میں ہنسنا بھول گیا ہوں اور وفورِ محبت سے چاہ رہا ہوں کہ خودکشی کر لوں۔

وہ ہنس رہی تھی۔ تو خودکشی کر لو۔

...ور حماقت کی حد تھی کہ مجھے یقین تھا اس کی محبت میں خودکشی کر کے میں ہمیشہ کے لیے جی اٹھوں گا۔

رامائن ڈیر! محبت کرنے والے لوگ بہت ضعیف الذہن ہوتے ہیں۔ ان ہونی باتیں کہیں عام لگتی ہیں اور بڑی عام باتیں وہ کچھ اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ ان ہونی باتیں معلوم ہوں میں تم سے یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ تم سے جنم جنم سے محبت کرتا ہوں رامائن، جب کہ اسی جنم میں تم سے ملنے سے پہلے میں نے تمہارے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا — لیکن ٹھہرو، مجھے یاد آ رہا ہے۔ میں نے اپنی پہلی ملاقات میں تم سے کہا تھا، تمہیں دیکھتے ہی میں پہچان گیا تھا تم وہی ہو، اور تم نے خوش ہو کر پوچھا تھا۔ کون؟

جو ہمیشہ میرے دل میں رہتی ہے۔

اب تم ہی سوچ کر بتاؤ کہ دل خون صاف کرنے کی مشین ہے یا عاشقوں کے سونے کا کمرا۔

رامائن، جو شخص اپنے چھکر میں نظر نہ آئے اس سے اس کے پیٹ یا دل یا دائیں یا بائیں گردے میں ملاقات نہیں ہو سکتی۔ ایسے شخص کو تو فوراً قبر میں لٹا دیا جاتا ہے۔ 'میں تم سے محبت کرتا ہوں' کا سادا سا مطلب یہ ہے کہ بولنے والے کی جنسی خواہش ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ تو بھائی یہ لو ایک چپاتی اور کھالو، یا یہ بھی کافی نہیں تو یہ لو ایک اور ـــ بس جی بھر گیا؟ ابھی ابھی تو بھوک سے دم نکلا جا رہا تھا ـــ اچھا، اب بتاؤ، یہ محبت وحبت کا کیا قصہ ہے؟ تم نے محبت کی ہے تو کون سا تیر مار لیا ہے؟ سب نارمل لوگ محبت کرتے ہیں، پیٹ بھر روٹی کھاتے ہیں۔ اتنی سی بات کے لیے اس غیر معمولی لہجے کی کیا ضرورت تھی کہ کسی الزبتھین کردار کے مانند آواز میں پورا ڈرامہ بھر کے اپنا پورا ہاتھ پھیلا کے کہو۔ مجھے بھوک لگی ہوئی ہے۔

رامائن، شیکسپیئر نے بکواس کی تھی کہ ہم میں سے ہر کسی کو اپنی زندگی کو ایکٹ کرنا ہوتا ہے۔ ایکٹ وہ کرتا ہے جو پیدائش پر ہی زندگی کو ازبر کرلے۔ پھر اسے سال بہ سال بول بول کر گزار دے۔ یہ کوئی زندگی ہے رامائن؟ زندگی ...... اگر ایڈونچر ہے اور اس کا ایک ایک لمحہ جینے کے لیے ہے تو یہ پل اس لیے خوب صورت ہے کہ ہمیں اپنی اگلے پل کی خواہش کی خبر نہیں۔ کسی ایک ہی خواہش کو عادت بنا لیا جائے تو وہ خواہش کیسے رہ سکتی ہے؟ جب میں نے تمہاری خواہش کی تھی تو بڑی ایمانداری سے کی تھی، مگر اب مجھے تمہاری یا تمہاری طرح کی دوسری عورتوں کی خواہش نہیں رہی۔ ان کے بھی ناک، منہ اور ٹھوڑی وہیں اور ویسے ہی ہوں گے جہاں اور جیسے تمہارے ہیں۔ اب تو مجھے ایک ایسی عورت کی خواہش ہے رامائن جس کی آنکھ اس کے ماتھے میں ہو کوئی ایسی عورت جس کی ٹیلی سکوپک نگاہ میں اس کا آس پاس تو کس میں نہ آتا ہو، پر فاصلہ امیز نقطے یوں آجاتے ہوں گویا وہ آس پاس ہی ہوں۔ تم وہ عورت نہیں ہو رامائن۔ تمہاری زندگی پرانی رام کتھا ہے۔ آج بے چارے راکششوں کی نسل ہی ختم ہو گئی ہے تو میں لڑوں کس سے؟ کیا گرانڈیل جوان تھے۔ ان کی بدنمائی میں کتنا حسن تھا! ان کی ایک آدھ عورت رہ جاتی تو میں اس سے شادی کرکے یا شادی کیے بغیر ایک نیم راکشش نسل کی بنا ڈالتا۔ اس نسل کی توانائی انسانیت کے مستقبل کو مخنث ہونے سے بچا لیتی۔

رامائن، ہم ان دیوتاؤں کی نسل سے ہیں جو عورت کو دیوی کہہ کے اس سے مباشرت کیا کرتے تھے بڑی تعظیم سے ان سے محبت کرتے تھے۔ دیوی! پہلے میں سوم رس پی لوں، پھر میں تمہارے من کے وشال بن میں پرویش کروں گا۔

جو آگیا، ناتھ!

ہم بھی ان دیوتا پرشوں کی روایت نبھا رہے ہیں۔

مادام، پہلے میں وہسکی کے دو گھونٹ پی لوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟
نو ناٹ آیٹ آل!
اور وہسکی کے دو، دس یا سو گھونٹ پی کر بھی ہمیں یہ احساس رہتا ہے کہ ہماری مباشرت کی خواہش، ابھی اپنے نقطۂ عروج پر نہیں پہنچی، ہمارے خون کے کیڑوں نے ابھی کلبلانا شروع نہیں کیا۔
اب کل ملیں گے مادام۔
کل، ہاں، ضرور!
روز ملتے ہیں مگر ملاقات کی نوبت نہیں آتی۔

شاید یہی وجہ ہے راماٸن، کہ تم مجھے اجنبی معلوم ہوتی ہو۔ دراصل تمھاری اجنبیت کے سبب سے ہی میں نے ابھی تک تمھارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اجنبی لوگ مجھے اپنے ہی معلوم ہوتے ہیں، اس لیے یہ سارے اپنے مجھے اجنبی ہی لگتے ہیں۔ تم حیران ہوگی۔ اس میں حیران ہونے کی کوئی بات تو نہیں۔ جب میری ماں کی موت کے بعد میرا باپ موت کو اوڑھ کر ہر دم الگ تھلگ بیٹھا رہتا تو اسے دیکھ کے بے اختیار رو دینے کی بجائے میں سوچتا کہ اس کے پاس جاؤں اور نہایت خوشگوار لہجے میں اس سے کہوں "مے آئی ہیلپ یو، ڈیڈی" — اس آڑے وقت میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ مجھے اپنے باپ سے بڑی محبت تھی راماٸن، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میں اس سے ناواقف تھا۔ اس کی وارفتگی سے میں پورے کا پورا وجود میں آیا۔ آنکھیں کھولیں، ناک سے سونگھنے لگا تو اپنے ماضی کی مانند اپنا باپ مجھے اجنبی معلوم ہونے لگا۔ ماضی جتنا گہرا ہو، رشتہ اتنا ہی ڈوبا ڈوبا ہوتا ہے، آج میرا یہ عالم ہے راماٸن، کہ مجھے یہ پتہ ہی نہیں، میرا باپ تھا بھی، یا نہیں۔ کتنا گہرا رشتہ ہے!
تم میرا باپ تو نہیں ہو سکتیں کہ میرا تمھارا تعلق صرف ماضیِ قریب سے شروع ہوا، پر چونکہ ہمارا تعلق — مجھے ایسا لگتا ہے۔ حال سے غائب ہو چکا ہے، اس لیے کچھ نہ کچھ رشتہ بن ضرور گیا ہے، تم بھی اجنبی ہو گئی ہو راماٸن — میرے ذہن میں ایک دو اجنبی ہوں تو اپنا سارا وقت انھی کے ساتھ صرف کروں مگر یہاں تو ایک پورا ہجوم ہے۔ کل ایک پرائیوٹ پارک کے دروازے پر میں "نو تھارو فیئر" کی تختی پڑھ رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ میرے ماتھے پر جلی حروف میں لکھا ہے "تھارو فیئر"۔
— ہماری پبلک لائف بڑی پرسنل ہوتی جا رہی ہے، اور پرسنل لائف اجنبیوں سے آباد ہے۔
ہمارا ذہن دراصل باہر کی پوری کائنات کا مظہر ہے۔ باہر کی دنیا میں گھومتے ہوئے مجھے یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے ذہن کے غیر مانوس مقامات میں ہی سفر کر رہا ہوں۔
راماٸن، باطن کے سفر کی مسافت کے ذکر سے مجھے اپنی ایک گزشتہ معشوقہ کا خیال آ گیا ہے۔
نہیں اس کا نام مت پوچھو، اور اگر پوچھنا ہی ہے تو یہی سمجھ لو کہ اس کا نام بھی راماٸن ہی تھا۔

اپنے ذہن کے اتنے بڑے اجتماع میں کس کس کا نام یاد رکھوں گا۔ تمہارے بعد اپنی سہولت کے لیے میں تمہیں بھی اسی نام سے یاد رکھوں گا جس نام سے اگلی میری جان پہچان نہیں ہوئی۔ ماضی کی طرح مجھے مستقبل بھی بڑا پیارا اور اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ وہ جانے کہاں پیچھے ہی پیچھے غرق ہو چکا ہے اور یہ جانے کہاں اوپر ہی اوپر ہے۔ یا نہ معلوم کس سمت او جھل ہے، پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب کہاں سے نمودار ہو ہو کر ماضی میں غائب ہو جاتا ہے۔ یا شاید ہمارے ماضی اور مستقبل دو نہیں، ایک ہی ہیں، وقت نے وقت ہے — اگر واقعی یہ ٹھیک ہے راماتن تو وقت کی پہچان میں انسان سے کتنی بڑی غلطی ہوئی ہے۔ اپنی اسی غلطی کی وجہ سے آسے مرنا پڑتا ہے، ورنہ ہونا اور نہ رہ جانا سمجھ میں آنے والی بات نہیں —— لیکن میں تو تمہیں اپنی کسی معشوقہ کی بات سنانے لگا تھا۔ اس کا نام بھی راماتن تھا۔ میں ہالی ڈے ٹرپ پر کشمیر پہنچا ہوا تھا۔ میرے قدموں میں ایک چشمہ پھوٹ رہا تھا، نامعلوم پہاڑوں کے اندر ہی اندر کتنی مسافت طے کر کے کہاں سے آ رہا تھا۔ اس کی آبی پشت پر مجھے اپنی اس معشوقہ کا خوب صورت چہرہ چشمے کا چہرہ ہی معلوم ہونے لگا۔ چشمے سے برآمد ہوتا ہوا ہماری دھرتی کا چہرہ۔ عورت کو محاورے کے طور پر دھرتی کہا جاتا ہے لیکن راماتن دھرتی ہی تھی راماتن، اپنے ساڑھے پانچ انچ کے اندر کروڑوں میل کے رقبے میں ہماری سالم اور ثابت دھرتی۔

ذرا میری مسافت کا اندازہ کرو رام۔ وہ مجھ سے کہا کرتی تھی۔ پورے بائیس برس سے اپنے اندر ہی اندر یہ سفر طے کر رہی ہوں اور ابھی دور دور بھی منزل کا نشان نظر نہیں آتا۔

اپنے جسم سے باہر نکلو دھرتی: لوگ تو چاند پر بھی جا پہنچے ہیں۔

چاند تو یہ ہے رام۔ اسے گلے لگانے کے لیے ہمارے ساگر کو اپنا پورا بازو بھی پھیلانا نہیں پڑتا۔ زمین اور چاند کا ایک دوسرے کے بغیر چارہ نہیں، دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں، مگر تم مجھ سے کتنی دور ہو، یہاں میرے ساتھ ہو مگر کتنی دور۔ ہماری زندگی اپنی اپنی ہے تم میرے محور میں نہ تمہاری۔

لیکن —؟

لیکن وکین کیا؟ تم مر جاؤ گے تو کیا میں بھی مر جاؤں گی، یا میں تمہیں چھوڑ دوں گی تو تم نہ رہو گے؟ تم کسی اور نظام کے ستارے ہو رام، اور میں کسی اور کی۔ ہماری اجنبیت ہی ایک دوسرے کی کشش کا باعث ہے۔ مجھے تمہاری دوری سے کوئی شکایت نہیں۔

راماتن ڈیئر، تم مجھے اس لیے اچھی لگتی ہو کہ میں تم سے ناواقف ہوں۔

تمہارے بارے میں مجھے صرف یہی علم ہے کہ میں تمہیں نہیں جانتا، اور میری اس ناواقفیت نے تمہیں میرے اعصاب پر کھڑا کر رکھا تھا۔ جب میں کہتا ہوں کہ مجھے تمہاری پروا نہیں تو دراصل میں

اپنی اس خواہش کا اظہار کر رہا ہوتا ہوں کہ کاش مجھے تمہاری پروا نہ ہوتی۔ میں تم سے بے تعلق ہوتا!
چند روز پہلے ایک دوست سے ملا تو اس نے چھوٹتے ہی پوچھا،
تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے رام؟
رامائن! میں نے اسے جواب دیا۔
میری بیماری یہی ہے رامائن، کہ مجھے تم یا تمہارے مانند کوئی اور خوب صورت عورت ہوگئی ہے۔
میں تمہاری شکل کو کئی بدنما اڑے ترچھے زاویوں میں چھپا کے اپنے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ تم مجھے نظر نہ آؤ۔ مگر تم صاف نظر آجاتی ہو۔ تم ماڈرن ایبسٹریکٹ آرٹ کا شاہکار ہو۔ رامائن، اور تمہارے تماشائی ان گنت ہیں اور سب میری طرح تمہیں ذہن فکر کرتے رہتے ہیں اور ان کی اس کوشش میں تمہاری چارمنگ نگران کے سامنے ابھر ابھر آتی ہے تم، تم نہیں، میرا اور اپنے سب دیگر تماشائیوں کا کوئی شاداں خیال ہو، اور شادمانی بڑی معصوم اور بے لباس ہوتی ہے اور اسے لاکھ ڈھانپو، اپنی ننگی پیاری جلد میں صاف نظر آجاتی ہے۔
مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ...... اپنی اس چٹھی میں میں رامائن کو بھول کر کسی اور سے مخاطب ہونے لگا ہوں — اس لڑکی سے — کیا نام تھا اس کا؟ — مجھے اس کا نام یاد نہیں آرہا ہے۔ میں نے کسی جانور کی طرح خالی الذہن ہو کر اس سے محبت کی تھی۔ میرے ذہن میں اس کے ماں باپ یا اس کا نام نہ تھا، بس اس کی محبت، ہی محبت تھی، بڑی بھنک اور تیز رو محبت۔ میں نے عورت کو پہلی بار اسی کی جلد میں ننگا دیکھا تھا اور مجھے لگا تھا کہ میرے سرور ترین خیالات اس کی شبیہہ میں ڈھل گئے ہیں اور میں نے اسے بے اختیار گلے لگا لیا تھا۔
رامائن کو چٹھی لکھتے ہوئے میں اپنی رَو میں رامائن کو بھول گیا ہوں اور اس لڑکی سے باتیں کرنے لگا ہوں میرے ساتھ اکثر یہ ہوتا ہے کہ کسی سے باتیں کرتے ہوئے بظاہر اسی سے مخاطب ہوتا ہوں مگر دراصل کسی اور سے باتیں کرنے لگتا ہوں۔

رامائن ڈیئر، یہ چٹھی میں نے تمہیں کئی نشستوں میں لکھی ہے۔ جب بھی لکھنے بیٹھا، یاد نہ آیا کہ پہلے کیا لکھ چکا ہوں۔ یہ تو پچھلی نشست میں لکھے ہوئے کی بات ہے، یوں بھی بات کرتے کرتے میں اس بات کو بھول ہی جاتا ہوں، یا اسے جلد جلد دل ہی دل میں پورا کر کے سمجھنے لگتا ہوں کہ میں نے وہ پوری بات کہہ دی ہے۔ اور کوئی نیا قصہ شروع کر دیتا ہوں، پر چونکہ مجھے کوئی خاص بات نہیں کہنا ہے، اس لیے تم سے اپنی یہ سب ادھوری یا مکمل باتیں کرتے ہوئے مجھے تامل محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ نہ جانے میں کیا کہہ رہا ہوں۔ فی الحقیقت مجھے تم سے کوئی عام بات بھی نہیں کہنا ہے۔ بس یوں ہی جو کچھ منہ میں آرہا ہے، کہے جا رہا ہوں۔ مجھے تم سے یا کسی اور سے کچھ بھی نہیں کہنا ہے۔ جب مجھے کسی سے واقعی کچھ کہنا ہو تو منہ سے ایک لفظ بھی ادا کرتے ہوئے مجھے بڑی

تکلیف ہوتی ہے۔ ایسے وقت میں اپنی زبان سے گراموفون ریکارڈ کا کام لینے لگتا ہوں اور منہ میں سوئی چلنے لگتی ہے اور لہو تھوک تھوک کر میں بے حال ہو جاتا ہوں۔

میری ساری باتیں دراصل اپنے آپ سے ہی ہوتی ہیں راماَن۔

مجھے کھانا دو

میں سیر ہو کے کھا لیتا ہوں

مجھ سے محبت کرو۔

میں اس وقت تک محبت کیے جاتا ہوں جب تک جی نہ بھر جائے۔

مجھ سے لڑو، ہنسو۔

میں لڑائی شروع کر دیتا ہوں، خوب ہنسنے لگتا ہوں۔

جب میں تم سے محبت کرنے یا لڑنے کو کہتا ہوں تو اصل میں میں اپنے آپ سے ہی کلام کر رہا ہوتا ہوں۔ تم یا کوئی اور یا سب اور — ساری کائنات میں ہی ہوں راماَن۔ جب میں مر جاؤں گا راماَن۔ مائی ڈیئر تو تم اور یہ ساری دُنیا مر جائے گی۔ ایک آدمی نہیں مرتا، ایک پوری کائنات مرتی ہے، کیونکہ زندگی بذاتِ خود زندہ نہیں ہوتی، ایک ایک ذات سے زندہ ہوتی ہے، اور اگر میں ایک پورا فرد ہوں تو ایک پوری زندگی بھی ہوں اور اس زندگی میں جو کچھ پیش آتا ہے مجھ ہی سے پیش آتا ہے۔

ہماری صدی کی پہلی یا دوسری جنگِ عظیم بھی صرف مجھ ہی سے پیش آئی اور اگر میں زندہ رہا تو میری ہی وجہ سے ہماری صدی کی تیسری جنگِ عظیم بھی ہوگی۔ اس کائنات کے سارے یتیم اور بے بس لوگ نہیں رو رہے ہیں، میں رو رہا ہوں، اور اُن پر ظلم ڈھانے والا بھی میں ہی ہوں۔ گاندھی کے بجائے میں ہی قتل ہوا...... راماَن ڈیئر: میں ہی گاندھی کا قاتل ہوں۔ ساری راماَن رام کتھا ہی ہے، میری ہی کہانی ہے۔

میں تم سے ہمکلام نہیں ہوں اور نہ اس معصوم اور ننگی لڑکی سے، جس سے کچھ کہتے ہوئے میں بھول ہی گیا کہ میں تم سے ہمکلام ہوں۔ مجھے کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے میں پاگل ہو گیا ہوں راماَن ڈیئر، میں نے اپنے آپ سے ہی مخاطب ہونے کے لیے یہ چٹھی لکھی ہے۔

[یہ چٹھی مجھے آج کی ڈاک سے واپس آگئی ہے]

☆☆

کتھا ایک پیپل کی

سارے کا سارا پیپل کا درخت کھلکھلا کر ہنس پڑا اور ہنستے ہنستے اس کا قد فٹ بھر اور اونچا ہو گیا۔ پرندوں نے پیپل کی ہلتی ہوئی شاخوں پر اپنے پیر دبا لیے۔ اور ایک کوّا کائیں کائیں کرنے لگا۔

"گھبراتے کیوں ہو بھئی، اپنا پیپل کاکا ذرا ترنگ میں آگیا ہے اور بس۔"

"کاکا ہے کہاں، ماں؟" ایک چڑیا کے بچّے نے اپنی ماں سے پوچھا اور جواب سننے سے پہلے ہی گھونسلے میں چاول کے ایک دانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تمہاری یہ بات مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی چھوکرے" اس کا باپ بولا۔

"تو پھر دوسری آنکھ سے دیکھو" چڑیا پھر سے اپنے بچّے کے قریب آگئی اور پیار سے اپنی چونچ کو اس کے پروں میں گھسیڑ لیا۔ "تمہارا ہی بچہ ہے۔ یا کم سے کم اپنی ہی ذات میں سے کسی کا ہے، کسی کوّے کی اولاد تو نہیں" اس نے اپنی آواز ذرا آہستہ کر لی کہ آس پاس کوئی اس کے بول کی بھنک نہ پالے۔ پہلے ہی سے سب کو شکایت تھی کہ اس براہمنی کو اپنی اونچی ذات پر بڑا مان ہے۔

"بس جی چپ رہو تم۔ بچے کی نیّا ڈبو کر دم لوگی۔"

"پھر وہی موئے آدم کا کانا سا محاورہ! ــــ ہمیں نیّا وَیّا سے کیا لینا ہے؟ ہمارے یہ پَر سلامت رہیں ــ" اس نے اپنے پر پھیلا کر اپنے نر کی طرف آنکھیں مٹکائیں۔

"کہو کیسے ہیں؟"

اور نر اپنی مادہ کے قریب سرک آنے کی خواہش سے بے تاب ہو ہو کر اس سے آگے نکل گیا

اور پھر لوٹ کر اس سے جُڑ کر بیٹھ گیا۔
ان کا گھونسلا چھوٹا سا تھا لیکن وہ تینوں اس قدر جُڑ کر بیٹھے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی دس اور بھی آ کر اُن سے جُڑ جائیں تو گھونسلا اتنا ہی کھُلا لگے گا۔
"گڈ مارننگ، ایوری باڈی!
پیپل کے کئی مکینوں نے تعجب سے سر اٹھا کر دیکھا کہ یہ کون کیا کہہ رہا ہے
اور سب سے اونچی شاخ پر بیٹھے ہوئے ایک طوطے نے ان کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہو کر چیخنے کے انداز میں دہرایا۔ گڈ مارننگ ایوری باڈی!
نہ طوطے کو معلوم تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور نہ پیپل کے باسیوں کو، اس لیے بولنے اور سننے والوں میں از خود طے پا گیا کہ ضرور کوئی بڑا گہرا نکتہ ہے۔
"نہیں، کوئی گہرا وہرا نکتہ نہیں۔ کبوتر نے غصّے سے اپنی مادہ کی طرف دیکھ کر کہا جو دیوانوں کی مانند سر اٹھائے پرائے مرد کو گھورے جا رہی تھی " میں بتاتا ہوں کہ اصل بات کیا ہے۔ اس طوطے کے اندر ایک دیو چھپا ہوا ہے۔"
کبوتری نے برقعہ اوڑھ لینے کے انداز میں اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں " ہائے اللہ! — تم کیسی ڈراؤنی باتیں کرتے ہو!"
" تو پھر وہ اپنی زبان سے کیوں نہیں بول رہا ہے؟"
"گڈ مارننگ ایوری باڈی!"
"سن رہی ہو؟ — اتنا بڑا دیو غریب کے گلے میں اُلٹی پالتی مار کر بیٹھا ہوا ہے۔ بے چارہ اپنے من کی سیدھی سادی بات کر پائے تو کیوں کر؟ — اور سنو! اری سو گئی ہو؟ — سنو —! — اگر اس طوطے نے یہیں ڈیرے ڈال لیے تو دیو ہمارے پیپل کا کاکی جڑوں میں اُتر کر انھیں کھا جائے گا اور پھر کا کا اور تم اور میں اور ہم سب دھڑام سے نیچے جا گریں گے۔"
"گڈ مارننگ، ایوری باڈی!"
طوطے نے اپنے پر کھول کر باریک سی شاخ سے اپنے پاؤں اٹھا لیے تو شاخ بھی اس کے پیچھے جانے کی خاطر بے اختیار اچھلی۔
"ار — رر!" کاکا اسے تھام نہ لیتا تو وہ ٹوٹ کر گر جاتی۔
"کہاں جا رہی ہو؟"
شاخ نے لہرا کر طوطے کی طرف دیکھا
"مجھے خود آپ معلوم نہیں کہ وہ کہاں جا رہا ہے، اس کے پیچھے تم کہاں جاؤ گی؟"

کاکا نے اسے گلے میں ڈال لیا۔ تیرا میرا مقدر ایک ہے پگلی۔ مجھے چھوڑ کر کہاں جاؤ گی! — اور جانا بھی چاہو گی تو ٹوٹ کر دم توڑ دو گی۔

طوطا نقروں سے ادھ قتل ہو چکا تھا اور شاخ نے اپنے بھرے بھرے جی سے اپنی باہیں پیپل کے گلے میں کس لی تھیں اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی ہری بھری سہاگن کے مانند وہ بڑھتی پھیلتی جا رہی ہے۔

"ایک بات پوچھوں؟" اس نے اپنے پیپل سے کہا "تمہارے پر کیوں نہیں ہیں؟"

پر نہ میر پگلی، اڑتے یا چلتے ہوئے محبت نہیں کی جا سکتی۔ پیپل کو اپنا پچھلا جنم یاد آ رہا تھا۔

"میری کہانی سنو گی؟ کئی سو سال ہو لیے ہیں۔ یہاں اگنے سے پہلے میں ایک آدمی تھا، ایک مسافر جسے کہیں بھی کوئی نہ جانتا تھا؛ سب لوگ، سب جگہیں میرے لیے اجنبی تھیں۔ مجھے کسی سے محبت نہ تھی۔ کوئی مجھ سے محبت نہ کرتا تھا۔ میری ساری عمر یوں ہی گھومتے پھرتے بیت گئی، اور بیت گئی تو مجھے پتہ چلا کہ ہر جگہ وہی جگہ ہے، وہی آسمان ہے۔ میں نے آسمان سے دوستی کرنا چاہا لیکن اس کی جانب ٹکٹکی باندھ کر مجھے محسوس ہوتا کہ وہ بہت دور ہے، میں کتنا ہی قریب جانا چاہوں یہ دوری جوں کی توں رہے گی — یہ دوری — ارے سو گئی ہو کیا؟ جب میں آدمی تھا اور پیہم چل چل کر دنیا کی ہر شے کے قریب آ جانا چاہتا تھا تو ہر شے مجھ سے جوں کی توں دور رہتی تھی۔ میں کسی کو اپنا نہ سکا، اور تو اور، میں اپنے آپ سے بھی چھن گیا، چلتے پھرتے جانے کہاں نکل گیا اور یوں اپنی ناکام تلاش میں میری ساری عمر گذر گئی۔ ارے نیند آ رہی ہے کیا؟ آنکھیں کھول کر میری بات سنو!"

"میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں تو تم مجھے سارے کے سارے نظر آنے رہتے ہو۔ بولتے جاؤ۔"

"تو سنو! — جب میں مرنے لگا تو بہت خوش تھا کہ میری روح پھر سے اڑ کر آکاش سے جا ملے گی — پھر اچانک میری روح نامعلوم کہاں چلی گئی یا شاید مجھے میری روح سمیت ہی دفن کر دیا گیا — یہیں، جہاں میں اگا ہوا ہوں اور — اور — نہیں یوں نہیں، آنکھیں کھول کر میری بات سنو۔ اس طرح مجھے لگتا ہے کہ میں اپنی ساری باتیں اپنے آپ سے ہی کئے جا رہا ہوں۔"

پیپل کی ساری شاخیں پیپل کو سن سن کر، اس کے قریب سرک سرک کر اس کے اندر آ دھنسی تھیں اور انہیں لگ رہا تھا کہ وہ سب اپنے محبوب کے باطن میں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی ہیں اور لپٹ کر سب ایک وہی شاخ ہو گئی ہیں جو اس وقت پیپل کی گود میں سر جھکائے اس کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

"لو، میں نے آنکھیں کھول لیں۔ بولو اب؟"

پیپل کی ملائم سی جڑ اس کی آنکھوں میں پہنچ کر گھل مل گئی "بس میری بھی ایک مشکل ہے میری جان

تم اپنی آنکھیں کھول لیتی ہو تو میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔

"تو میں پھر اپنی آنکھیں بند کر لوں؟"

"نہیں، یوں ہی میری طرف تک تک کر مجھے سنتی رہو۔"

"بولو!"

ہوا یہ کہ جب لوگوں نے مجھے یہاں دفنا دیا تو میں ابھی مرا نہ تھا، لیکن دھرتی سے باہر آنے کے لیے اب میرے لیے ایک ہی راستہ کھلا تھا، میں دھرتی میں سرایت ہو جاؤں، اور میں اسی راہ پر چل نکلا اور مٹی میں سرایت ہو ہو کر ایک دن مٹی کے باہر آپہنچا اور منہ کھول لیا۔

"ہائے جب تم نئے نئے اگے ہو گے تو کیسے لگتے ہو گے!"

"میں اگ کر باہر آیا تو میری پہلی خواہش یہ تھی کہ بے اختیار اڑنا شروع کر دوں۔ ارے کہاں جانا چاہتے ہو؟ ساری کی ساری زمین نے مجھے اوپر نیچے سے دبا کر پکڑ رکھا تھا اور میں بھری بھری مٹی کے اندر ہی اندر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میرے وجود کے نیچے اب پاؤں نہیں رہے تھے۔ میری جڑیں تھیں جو آہستہ آہستہ بڑی ہو ہو کر زمین میں دھنستی جاری تھیں کہ مجھے ان کے ہلنے جلنے کا قطعاً پتہ نہ چلتا تھا۔ اوپر اوپر سے ہوا میں پھڑ پھڑاتے ہوئے مجھے لگتا گویا اپنی بے اختیار دوڑنے کی خواہش سے میری سانس پھولی ہوئی ہے۔ اور پھر میں تھک ہار کر سو جاتا اور خواب میں مجھے دکھائی دیتا کہ :

"تم میرے ہی پاس آنا چاہتے تھے نا؟" آکاش دھرتی سے آلگا ہے۔

"ہاں!"

"تو لو، میں خود ہی تمہارے پاس آگیا ہوں"

پیپل کی اس سب سے اونچی تازہ دم شاخ کا آنچل اڑ کر اس کے گھٹنوں پر آگرا تھا مگر وہ اپنے اٹوٹ انہماک سے سنتی رہی۔

اور پیپل اپنا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور اسے اس طرح ننگے منہ، ننگے سر اپنی طرف متوجہ پا کر جھوم گیا اور جھومتے ہوئے اسے اپنی بات یاد نہ رہی۔ "سنو!"

"سن تو رہی ہوں۔"

"نہیں، کیں۔"

"کیں وَیں کچھ نہیں۔ اپنی کہانی جاری رکھو۔"

"ہاں، ہاں، لیکن۔"

"میں سب جانتی ہوں، تمہارے من میں کوئی میلا سا خیال آیا ہو تو منہ دھو آؤ۔"

"کیا فائدہ؟ منہ دھو کر بھی خیال تو میلا ہی رہے گا۔" پیپل نے شاخ پر ہاتھ ڈالنا چاہا مگر وہ ہل ہل کر اس

ے صاف بجتی رہی۔

"ہہ ہہ — ہہ!"

(" پیپل کاکا کے ہنسنے کی آواز کہاں سے آرہی ہے؟"

"اوپر اپنی رانیوں کے پاس گیا ہوگا۔ آؤ، ادھر آؤ ذرا چونچ پھیر کر تمھارے پر صاف کردوں۔")

"اچھا کم سے کم میری بات تو سن لو۔"

"ہاں، شریفوں کے مانند صرف باتیں کرنا ہے تو دن رات کرتے رہو بولو!"

"دھیان سے سنو، بڑی خاص بات ہے۔"

پیپل کی دوسری شاخیں بھی جھک کر سننے لگیں۔

مجھے پیدا ہوئے کئی سو سال ہو چکے ہیں اور اس دوران میں اپنی ان گنت شاخوں سے بیاہ رچا چکا ہوں ہر نئے موسم میں پوری کھیپ سے شادی کرلیتا ہوں، اور پھر وہ کھیپ پرانی ہوجاتی ہے تو میں اور وہ سب ایک ہوجاتے ہیں، ایک پیپل، جسے آئندہ اپنی نئی شاخوں سے والہانہ محبت کرنا ہے۔

"میری محبت اور عمر کو زوال نہیں، کیوں کہ میری ذات میری ان بے حساب محبوباؤں سے بھی عبارت ہے جنھیں ابھی صدیوں پیدا ہوتے چلے جانا ہے — سن رہی ہو؟ — اپنی جن شاخوں سے بھی میں نے اب تک محبت کی ہے انھوں نے بالآخر میری ذات بن کر میری سبھی محبتوں میں شرکت کی ہے، مستقبل کی سبھی محبتوں میں شرکت کریں گی۔" پیپل نے شاید اپنے مستقبل کی طرف نظر اٹھائی اور نیچے سے اوپر تک اپنی سب شاخوں کے یک بہ یک قالب و بہ یک روح لہرا اٹھا اور یہ سوچ کر لہرا تا رہا کہ میری روایتیں اور جدتیں ہم وجود ہیں۔

پیپل کی دور تنہائی بلندی پر گنجان شاخوں میں سے ایک کوے نے سر جھکا کر کے نیچے دیکھا اور اپنی مادہ سے گویا ہوا۔

"ارے سنتی ہو؟ گھونسلے سے باہر آؤ۔"

کوّی تیز برآمد ہوکر اپنے کوے کے پاس آگئی اور اس کی گردن پر چونچ مار کر کہنے لگی۔

"پل بھر بھی چین سے بیٹھنے دیتے ہو؟ بولو، کیا بات ہے!"

"وہ دیکھو، وہ عورت کاکا کو پانی پلا رہی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"خودکشی، تاکہ میری جان چھوٹے۔" کوے کو غصہ آنے لگا۔ "ہر وقت لڑائی کے لیے تیار رہتی ہو۔

"کو — !"

کوے نے سر اونچا کر کے کوئل کی جانب دیکھا، جو ابھی ابھی وہاں آ بیٹھی تھی۔

"کو — کو!"

"کتنی میٹھی آواز ہے!" کوے نے اپنی چڑچڑی مادہ سے کہا "اور کتنا پیارا رنگ ہے، گھور کالا!۔
تم بھی اتنی چڑچڑی نہ ہوتیں تو تمہاری سیاہی پھیکی پڑنے سے بچی رہتی"۔
"وہ موئی راضی ہو" کوّی نے تنک کر کہا "تو اسی سے اپنا گھونسلا آباد کر لو۔ میں چلتی ہوں" وہ پھڑپھڑانے لگی۔
"کہاں؟"
"اتنی بڑی برادری ہے، تم نہ سہی، کوئی اور سہی"
"بڑی نرموہی ہو، پل بھر میں برسوں کا ساتھ چھوڑ دینے پر تیار ہو جاتی ہو۔ ابھی تو ہمیں ڈیڑھ سو برس اور اکٹھا گزارنے ہیں"۔
"کو۔ کو"
"اب کہیں جا کے ہمارے بھوگ بلاس کے دن شروع ہوئے ہیں۔ تم چلی گئیں تو میرا کیا ہو گا؟"
جیسے کوّی کی کوئی تنی ہوئی گانٹھ اپنے آپ کھل گئی ہو، وہ دھیرے سے اپنے نر کے قریب آگئی اور بڑی آہستگی سے اس کی چونچ سے چونچ لگائی۔ ایک پر کو پھیلا کر کوے کے پروں پر ڈال دیا اور مسکرانے لگی اور کوے کو برسنے سے پہلے تنی ہوئی گھور گھٹا کی طرح سہانی کالی معلوم ہونے لگی۔
"کو۔کو!"
کوے کی آوارہ نظر اچانک پیچھے کی طرف گھوم گئی جہاں وہ عورت کھڑی پیپل کو پانی دے رہی تھی۔
"وہ دیکھو!۔ جانتی ہو وہ عورت پیپل کو پانی کیوں دے رہی ہے؟"
"کیوں؟" وہ اپنی چونچ سے اپنے نر کا وجود صاف کرنے لگی یا اس کے وجود سے اپنی چونچ۔
"اپنی ہی پیاس بجھانے کے لیے! ۔ کتنی پیاسی نظر آرہی ہے!۔ ادھر سے دیکھو، اس کی آنکھوں میں پورا ساگر بھرا ہوا ہے لیکن بیچاری کا حلق سوکھا ہوا ہے۔ میٹھے پانی کی ایک بوند بھی میسر نہیں!"
"بس تمہاری اسی ایک بات سے میں چڑ جاتی ہوں۔ سیدھی بات تمہارے منھ سے نکلتی ہی نہیں۔ اتنے سیانے بنتے ہو کر لگتا ہے، تم محبت کر ہی نہیں سکتے"۔
"بے وقوف میں سیانا نہ ہوتا تو سینکڑوں ہزاروں میں سے ایک میں ہی تمہیں اڑا کر کیسے لے آتا؟"
"لیکن میرے سیانے کوے، اب ذرا بے وقوف بننا بھی سیکھ لو، نہیں تو کوئی اور مجھے اڑا لے جائے گا"
"اور تم چپ چاپ اس کے ساتھ اڑ جاؤ گی؟"
"اس وقت کے بارے میں تمہیں آج کیا بتا سکتی ہوں؟ کوّی کی بجائے عورت ہوتی تو مجھے معلوم ہوتا کہ کس دن، کس وقت مجھے کس مردوئے کو چھوڑ دینا ہے۔"
"اری دیکھو" کوے نے اپنی مادہ کے لیے جگہ بنانے کے لیے شاخ پر ذرا پرے ہٹ کر کہا "وہ عورت

ہاتھ جوڑ کر پیپل کاکا سے کچھ مانگ رہی ہے جانتی ہو، کیا؟"

"کیا؟"

"بچہ!"

"ہاں، اسے اپنے شوہر کے مقابلے میں ہمارے پیپل کاکا پر زیادہ وشواس ہے۔"

"ہاں، کیوں کہ وہ جب بھی یہاں آتی ہے کاکا یہیں اس کا منتظر ہوتا ہے۔ مردوں اور کووں کا کیا بھروسہ آج کسی سے ملو تو کل اس کی شکل بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے، یا شاید موا اپنی جگہ کوئی اور کھڑا کر کے کہیں نکل جاتا ہے۔"

میری طرف دیکھو، کیا میں بھی۔؟

"مجھے کیا پتہ، تم وہی ہو، یا کوئی اور ہو؟" کوی بڑی بے چارگی سے کائیں کائیں کرنے لگی——— پھر بھی شکر ہے کہ کوئی نہ کوئی تو ہو تم جو بھی ہو، تم بھی نہ ہوتے تو میں تمہارا کیا بگاڑ لیتی؟ بس اس عورت کے مانند کاکا کو نہلانے کا کام اپنے ذمے لے لیتی جہاں بھی چھوڑ جاؤ، کاکا وہیں کا وہیں رہتا ہے۔"

"تو جایا کرو اپنے کاکا کے ہی پاس" کوے کو تاؤ سا آنے لگا "پیٹ میں درخت کا اتنا بڑا انڈا ہو گیا تو دم نکل جائے گا" وہ غصہ بھول کر اپنی بات پر کائیں کائیں ہنسنے لگا۔

"شرم کرو، کاکا کے بارے میں کیسی باتیں کرتے ہو!"

"تو کیا ہوا؟"

کوا اور کوی اپنے گھونسلے سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے باتوں میں مشغول تھے کہ اچانک اس ٹہنی پر کہیں سے ایک ناگ رینگ آیا اور گھونسلے میں رکھے ہوئے کوے کے انڈوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کائیں!— کائیں! کائیں!—" کوی اس جانب دیکھ کر چیخنے لگی۔

"کائیں! کا—!" کوے نے مدد کے لیے پکاری۔

لیکن سانپ زبان چاٹ چاٹ کر بڑے انہماک سے اپنے کام میں لگا رہا۔

"کائیں! کائیں! کا—!"

چڑے نے اپنی چڑیا سے کہا۔

"کوے کی ذات کتنی بدتمیز ہوتی ہے! خواہ مخواہ شور مچا مچا کر ہمیں پریشان کر رہے ہیں۔ جاہل! — ادارہ!"

"چھوڑو، تمہیں کیا؟ لڑائی بھی انھی سے کرنا چاہیے جو شریف اور مہذب ہوں۔"

کبوتری نے اپنی آنکھیں بدستور بند رکھیں اور اپنے کبوتر سے کہنے لگی "کاکا سب اچھوں بروں کو ہیا

ہنس کر جگہ دے دیتا ہے۔ ان کی کائیں کائیں سن سن کر مجھے ڈر لگنے لگتا ہے کہ تم بھی اپنی گٹ ۔ گوں چھوڑ کر ایک دن اچانک کائیں کائیں کرنا شروع کر دو گے۔"

اور کبوتر نے اس کی گردن میں اپنی گردن ڈال دی "چپ چاپ اسی طرح پڑی رہو۔ ہمیں کیا لینا دینا ہے؟"

"کائیں! کائیں! کا۔!"

سانپ نے زبان چاٹ چاٹ کر لوٹے پھوٹے انڈوں سے منہ موڑ لیا۔ ذرا رک کر مسکرا کر کوّے کوّی کی جوڑی کی طرف دیکھا اور نیچے کی طرف رینگنے لگا اور جب کافی نیچے اتر گیا تو کوّا کوّی اپنے گھونسلے کی طرف لپکے اور اپنے ٹوٹے پھوٹے انڈوں کے خالی خولی چھلکے دیکھ دیکھ کر آہ و زاری کرنے لگے۔ کائیں! کا۔!"

کئی اور کوّے وہاں جمع ہو کر ان کے سوگ میں شامل ہو گئے۔

"ارے بھئی، کیا ہو گیا ہے؟" پیپل کا کاشاید اپنے اندر گھسا ہوا تھا جو اتنی دیر سے یہ چیخ پکار سنائی نہ دی۔

"کووں کی برادری نے یک زبان فریاد کی "کائیں!"

اور کاکا نے گھونسلے میں ٹوٹے ہوئے انڈوں کو دیکھا اور ابھی وہ کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے تنے پر کسی کا رینگنا محسوس کر کے چونک پڑا۔

اسی اثنا میں کاکا کے چونکنے کے احساس سے کالے ناگ نے اس کا تنا ڈس لیا اور زہر سے کٹ کر اس کی کھال کا ایک ٹکڑا نیچے آگرا۔

کاکا نے ناگ کو اپنے پیروں تلے مسل دینا چاہا لیکن جوں کا توں کھڑا رہا کہ اس کے پیر ہی کہاں تھے؟ ناگ اپنی فتحیاب پھنکاریں بلند کر کے اچھل کر زمین پر آگیا اور سب کے دیکھتے ہی دیکھتے اوجھل ہو گیا۔

کاکا غصے سے دانت پیس پیس کر اپنی جڑوں سمیت اپنے وجود کے اندر ہی بھاگ رہا تھا لیکن سانپ تو کہیں باہر چھپا ہوا تھا۔ شاید اس سے دو ایک قدم پرے چھپ کر اپنی زبان چاٹ چاٹ کر کاکا کی مجبوری پر ہنس رہا تھا کہ جس کا آدھا وجود زمین میں گڑا ہو، وہ اتنا بڑا ہونے پر بھی میرا کیا بگاڑ سکتا ہے، جب میرا جی چاہے گا اس پر جا چڑھوں گا۔ اپنی اسی جگہ گڑے گڑے اس کی کھال اتنی موٹی ہو گئی ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں کہ میں اس کے وجود پر مزے سے رینگ رہا ہوں، اپنے اندر ہی اندر پھیل پھیل کر خوش ہو رہا ہے۔

"میں ۔ میں ۔!" کاکا اپنے بارے میں سوچ کر غصے سے کانپ رہا تھا اور اس سے جڑی ہوئی ساری شاخیں سائیں سائیں کر کر کے اس کی منت سماجت کر رہی تھیں اور ہوا تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"کائیں! ۔ کائیں!"

کاکا کے ٹھنٹھ سے قریب ایک چھوٹا سا پودا ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا اور رنگ رہا تھا کہ اس نے منوں

مٹی کی جکڑ سے آزاد ہو جانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔
نئی نسل کے اس نمائندے کی تندی کاکا کو بھلی معلوم ہونے لگی اور وہ اپنے ٹھنے میں بیٹھ کر اس پودے
سے گویا ہوا: ذرا اور زور لگاؤ میرے نو عمر دوست، ورنہ ابد تک تمہارے سینے پر سانپ لوٹتے رہیں گے۔
شاباش! — اور زور لگاؤ — مٹی سے باہر نکل کر تمہیں ظلم کا پیچھا کرنا ہے، دوڑ دوڑ کر جھپٹنا ہے! شاباش! —
اسی ایک جگہ پر اونچے ہو گئے تو اور پستی میں جا دھنسو گے، قیامت تک زندہ درگور رہو گے، زندگی تمہاری سزا
ہوگی! —

• شاباش!
جیلی کاکا کی سب سے اونچی شاخ پر لٹکنے کے انداز میں بیٹھا کوئی الو دن دھاڑے قہقہے لگانے لگا
جیسے تند ہواؤں کی سائیں سائیں شائیں کا سماں باندھنے لگی۔

لبسا اچھے ہیں۔ میں بڑی خوش ہوں مگر آپ کی یاد آتی ہے بھیا تو میرا رونا نہیں تھمتا۔"

"ارے پگلی، میں دور تھوڑا ہی ہوں۔ یہ ہندوستان ہے اور ساتھ ہی یہ پاکستان۔ بس ذرا آنکھیں بند کرلو
اہیہ لو میں تمھارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ روؤ نہیں ـــ نہ ـ نہ ـ دیکھو میں بھی تمہاری طرح مورکھ ہوں میرے
گی آنسو نکل آئے ہیں۔" (یا اللہ! کیا روحیں بھی روتی ہیں؟)

"ابا جان میں باہر جاؤں گا۔"

"باہر کرفیو ہے بیٹا۔"

"کرفیو کیسا ہوتا ہے ابا۔ آپ باہر جا کے اُسے بچائیے وہ لوگ اُسے ماریں گے۔ جائیے ابا! جائیے! کرفیو کو
لاسے آئیے۔"

مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ کرفیو ہمارے دروازے کے باہر سہما ہوا کھڑا ہے۔ میں نے اُٹھ کے چپکے سے
ملازہ کھولا ہے اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اندر گھس آیا ہے اور اس کی بید سہمی ہوئی شکل دیکھ کر خوف کے مارے
بلا اپنے کمرے سے دوڑ کر وجود کے اندر چلا آیا ہوں اور جو واقعہ دو سال پہلے اپنے وجود کے اندر دیکھا تھا اُسے اپنے
ذکن میں بار بار ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ کسی سفاک نے اپنے بوجھل کلہاڑے کو دونوں ہاتھوں سے سر کے اوپر اٹھا لیا
ہے۔ک بک! میرا بڑا بیٹا کٹ کر گر گیا ہے۔ میری مضبوط ترین شاخ تو کٹ گئی ہے۔ میرے تنے سے سفید خون
بہ رہا ہے۔ مجھے رونا نہیں آرہا۔ میرے بیٹے کا قاتل رو دیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میرا رامو بھی اسی طرح مرا تھا۔ وہ بدستور
لاسے جا رہا ہے، جیسے اس نے میرے رحمو کو قتل نہیں کیا بلکہ کسی اور نے اس کے رامو کو قتل کیا ہے۔ وہ اپنے غم کی
ملب نہ لاکر پاگل ہو گیا ہے اس نے میرے رحمو کو پھر دونوں ہاتھوں سے سر کے بل اُوپر اٹھایا ہے اور اسے روکنے کے
سلے میں نے ہاتھ بڑھایا ہے مگر خیالوں کے ہاتھ گرفت پر کہاں قادر ہوتے ہیں؟ میرا بچہ پھر قتل ہو گیا ہے۔ میں رابرٹ
کینیڈی کا باپ ہوں۔

جوزف، تم تو دوسری جنگ عظیم میں کام آ گئے تھے۔ اب پھر تیسری جنگ کے لیے کہاں سے آکر صف
آرا ہو گئے ہو بیٹا؟ جان، تم رابرٹ کے کان میں کیا پھونک مار گئے تھے کہ وہ بھی پیچھے پیچھے نکل پڑا ملکِ عدم
کرا ہو! ملکِ عدم میں کوئی کسی کو نہیں ڈھونڈ سکتا۔ اس بے چہرہ کائنات کی خاک چھاننے کی بجائے یہیں
ہمارے ساتھ رہو زندہ رہو گے تو بچھڑ کر بھی تصور میں ایک دوسرے سے مل لو گے اگر مر جاؤ گے تو تمہارے جسم کے ساتھ
تمہارا تصور بھی مر جائے گا۔ اِدھر آؤ ایڈورڈ تم کینیڈی خاندان کے بجھتے چراغوں کی لو ہو۔ اِدھر آؤ، اپنے بوڑھے
باپ کے ساتھ بیٹھو۔ آؤ کافی پیئیں بیٹا، اور گڈ اولڈ ٹائمز کی باتیں کریں جب ہم پر گاڈ آل مائٹی اپنی پیہم برکتیں نازل کیا
کرتا تھا۔ بیٹا، جیزس کے باپ کو ان بُرے دنوں کا ذمہ دار مت ٹھہراؤ۔ خدا رحیم ہے بہر صورت رحیم۔ اگر وہ رحیم نہ ہوتا
تو تم بھی اپنے بھائیوں کے مانند چل بسے ہوتے ارے! ؟ کہاں جا رہے ایڈورڈ بیٹے؟ مقبروں میں تمہارا دم گھٹتا ہے؟
ہمارا بھی دم گھٹتا ہے بیٹا، مگر مقبرے محفوظ ہیں۔ یہیں پڑے رہو۔ مردے کبھی نہیں مرتے۔ یہاں تمہیں کوئی نہیں مارے

گا نہیں ؟ کیوں نہیں ؟ کیا تم بھی اپنے بھائیوں کے مانند... ؟ کیا تم بھی بیٹا... ؟ کیا... ؟

:—

" پھر دروازے کی طرف جا رہے ہو بیٹا۔ خبردار! باہر کرفیو ہے "۔

" نہیں آپا، میں باہر کرفیو کے ساتھ کھیلوں گا "۔

میں اپنے معصوم بچے کو کیسے سمجھاؤں ؟ وہ لوگ بھی تو کرفیو سے کھیلنے کے لیے ہی نکل آئے تھے۔ کیسا مزیدار کھیل تھا! روشنی کا کھیل، اتنی دلفریب روشنی کہ نظر دھوکا کھا جائے۔ انسان جل رہے ہوں اور گمان یہ ہو کہ پھلجھڑیاں جل رہی ہیں۔ آپ کیوں منع کرتے ہیں ؟ آتشبازی کا موقع روز روز تھوڑے ہی ملتا ہے خوب تالیاں پیٹو، کھلکھلا کر ہنسو تاکہ لوگ چیخ رہے ہوں تو معلوم ہے کہ پٹاخے ٹھا ٹھا قہقہے لگا رہے ہیں۔ طبیعت گدگدا اٹھے تو آس پاس کی عمارتیں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی نظر آنے لگتی ہیں۔ ہنسو ہنستے جاؤ تاکہ تمہیں یاد نہ رہے کہ کب ہنسا جاتا ہے ؟ ہنسی کا بھی کوئی ٹائم ہوتا ہے بھلا ؟ بس جب ہنسنے کو جی چاہا ہنس لیا۔

ایک امریکی نے ایک انگریز سے پوچھا۔

آپ ہنستے ہیں تو آپ کے چہرے پر اتنا کھنچاؤ کیوں آجاتا ہے ؟ "

" کیونکہ ہم مقررہ اوقات پر چہرے کی ورزش کے لیے اپنے آپ کو ہنسنے پر مجبور کرتے ہیں "

" اسی لیے آپ اپنی سلطنت تباہ کر بیٹھے۔ ہم تو بے سبب ہنستے رہے ہیں اور اپنے اردگرد سب کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح بے سبب ہنسیں "

" اور اگر وہ بے سبب نہ ہنسیں تو "

" تو ہم انھیں گولی مار دیتے ہیں "

" مارٹن لوتھر کنگ! سنا تم نے ؟ تمہیں اس لیے گولی مار دی گئی کہ تم نے بے سبب ہنسنے سے انکار کر دیا۔ ٹھیک ہے، تمہارے پاس بے سبب ہنسنے کا بھی کوئی سبب نہ تھا، مگر جان بچانا کیا اسباب میں شمار نہیں ہوتا ؟ لیکن شاید ہنسنے کے باوجود تمہاری جان کو بدستور خطرہ لاحق رہتا۔ اگر سفید لوگ تمہارے تاریک چہرے پر افسوس کے نشان نہیں دیکھ سکتے تو اس اندھیرے میں تمہاری خوشی کا نشان کیونکر ملتا ؟ تمہیں ہر صورت میں قتل ہونا تھا مارٹن لوتھر کنگ، کیونکہ تمہارے چہرے کی تاریکی سے وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ امریکی تمدن کو اندھیرے سے خوف محسوس ہوتا ہے اسی لیے وہ ہمہ وقت روشنی سے گھرا رہنا چاہتا ہے۔ ایجوکیشن فار لائٹ لونگ فار لائٹ کلنگ فار لائٹ۔ امریکی تمدن سوتا بھی ہے تو ڈر کے مارے چکاچوند روشنی میں، ان حالات میں اسے نیگرو چہرے کی بے نشان تاریکی سے الجھن کیوں نہ ہوتی ؟ جوں جوں روشنی بڑھتی جاتی ہے اندھیرا ختم ہوتا جاتا ہے۔ اندھیرے کو ختم ہونا ہی ہے، اندھیرے کو ختم ہونے دو۔ تم خواہ مخواہ دنگا کر رہے ہو کالے لوگو۔ یہ فساد۔ کرفیو — مصنوعی روشنیوں کی یلغار — اندھیرے کی بے چین لکیریں جو روشنی کے گھیرے میں معدوم ہو جائیں گی۔ روشنی،

"ابا! میں باہر جاؤں گا۔"

میرے بیٹے کو معلوم نہیں کہ باہر بے کراں روشنی اس کے وجود کو ہر جانب سے جکڑے گی اور جکڑ جکڑ کر، اس کے جسم میں سرایت ہو کر آر پار ہو جائے گی اور پھر بے کراں روشنی میں وہ کہیں نظر نہ آئے گا اس کی جگہ اندھی اندھی روشنی نظر آئے گی، روشنی جو قطعاً خالی ہو۔

باہر جانے کی بجائے میں اپنے بیٹے کے ساتھ زمین کی اندھیری تہوں میں گھسنا چاہتا ہوں ان تہوں میں رینگ رینگ کر ہماری ٹانگیں اور ہاتھ گھس جائیں گے گھس گھس کر غائب ہو جائیں گے اور ہمارے سر اور دھڑ برابر ہو کر گول ہوتے جائیں گے اور ہم سانپوں کی کوئی نئی نوع اختیار کر لیں گے۔ سانپوں کی لمبی عمر کا باعث ان کی زمیں دوز زندگی ہے، اسی زندگی کی ٹھہری ٹھہری تاریکی سے وہ دیرپا ہیں اور زمین کے زہر سے ضائع ہونے کی بجائے وہ اسے اپنے سر میں جمع کرتے رہتے ہیں جو گہرا اور گاڑھا اور بالآخر جامد ہو کر من بن جاتا ہے جس سے تاریکیاں بینا ہو اٹھتی ہیں۔

میرا بیٹا پہلے ہی بوکھلایا ہوا تھا ورنہ میں اس سے کہتا" آو بیٹا زمیں میں دھنس جائیں" دفعتاً وہ بے اختیار رونے لگا ہے

"نہ رو، بیٹا۔ نہ رو۔ چپ !۔۔ چپ ہو جا!۔ بس اب چپ ہو جا!"

میرے بیٹے کو شاید اپنی مرحوم ماں یاد آرہی ہے جس کی شکل وہ بھول چکا ہے، شاید وہ اس لئے رو رہا ہے کہ اسے اپنی ماں کی شکل یاد نہیں آرہی ہے، مجھے بھی اپنی ماں کی شکل یاد نہیں آرہی ہے ہم سب یتیم ہیں اور کسی چہرے میں ہمیں اپنے چہرے کا سراغ نہیں ملتا، کوئی بھی ہمیں اپنا معلوم نہیں ہوتا۔

"آؤ بیٹے، ادھر آؤ میرے پاس"

میرا بیٹا چپ ہو گیا ہے، شاید اپنے کول کندھے پر میرے ہاتھ کا بوجھ محسوس کر کے وہ سہم گیا ہے کہ اگر وہ چپ نہ ہوا تو میں اسے پیٹوں گا۔ میرا بیٹا مجھے شک کی نظروں سے دیکھ دیکھ کر جوان ہوگا، مجھ سے نفرت کی یہ جڑ اس کے دل میں بڑھتی پھیلتی جائے گی۔ بڑا ہو کر وہ میرا اس لئے پاس کرے گا کہ اسے مجھ سے نفرت ہے۔ ہم سب یتیم ہیں اور ہمیں اپنے اوّلین چہرے بھول چکے ہیں جن سے ہمارے چہرے برآمد ہوئے۔ ہمیں سب چہرے اجنبی معلوم ہوتے ہیں، مانوس اجنبی۔ ہم صرف اجنبیت سے مانوس ہیں، ہمارا کوئی نہیں اور جب ہم کسی سے یہ کہتے ہیں کہ تم ہمارے ہو تو ہم جھوٹ بولتے ہیں۔

"ادھر آؤ بیٹے" ہیں! میرا بیٹا اپنی خواہش سے چپ نہیں ہوا بلکہ خوف کے غلبے سے اس کی رونے کی آواز سلب ہو گئی ہے۔ ممکن ہے اس اضطرابی کیفیت میں اسے لگ رہا ہو کہ میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔ رحمو کو بھی تو اس کے باپ نے ہی قتل کیا تھا۔!

"ڈرو نہیں شہزادے! ڈرتے کیوں ہو؟ بس کل کرفیو ہٹ جائے گا تو تمہیں سارے شہر کی سیر کروانے

کے لیے جاؤں گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ کل تک سب ٹھیک ہوجائے گا بیٹا۔"
کل تک! ہم کب سے کہہ رہے ہیں کہ کل تک سب ٹھیک ہوجائے گا کیا ہماری دُنیا تہ و بالا ہوچکی ہے اور ہم اپنے سیٹیلائٹ سے لڑھک کر خلار میں آگرے ہیں؟ وقت یہاں عدم موجود ہے۔ کل کبھی نہ آئے گی۔

"بیٹا، کل تک ــ" شٹ اَپ۔ تم چاند تک نہ پہنچ پاؤ گے۔ تمھارا راکٹ خلا میں غرق ہوچکا ہے۔ تمھارے کرۂ ارض کا ذرہ ذرہ خلا میں ڈوب کر خلار بن چکا ہے۔ بیٹا، کیا تم میری آواز کو سن رہے ہو؟ کیا میں واقعی بول رہا ہوں، یا مجھے یوں ہی لگ رہا ہے کہ میں بول رہا ہوں؟ کیا میں ہوں؟ تم ہو؟ خلار میں روحیں بھی تو تحلیل ہوجاتی ہوں گی!

"تمھیں ایک کہانی سناؤں بیٹا؟ بڑی مزیدار کہانی ہے سنو گے؟" میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کونسی کہانی سناؤں، مگر میں چاہتا ہوں کہ ایسی کہانی سناؤں جس سے میرے بچے کا دل بہل جائے۔ اس کا خوف دور ہوجائے اس کا کھلکھلا کر ہنسنے کو جی چاہے کسی نیک انسان کے خوب صورت مستقبل کی خوش کن کہانی۔
شٹ اپ! جھوٹ مت بکو!
"ایک تھا ــ" میں کہانی شروع کرتا ہوں۔
"ایک تھا ــ" کون تھا ایک؟ میں سر کھجا رہا ہوں کہ وہ کون تھا!
"ایک تھا بڑا نیک آدمی۔" بڑا نیک آدمی! کون تھا وہ نیک آدمی؟ اس کا نام اور پتہ اور پیشہ بتاؤ اور ثابت کرو کہ واقعی نیک تھا۔ بولو! بولو! وہ آدمی بڑا نیک تھا تو اس کی نیکی کا ثبوت پیش کرو۔
"وہ آدمی ــ" میرا خوف زدہ بیٹا میری بوکھلاہٹ پر کھلکھلا کر ہنس پڑا ہے اور میرا جی اتنا خوش ہوگیا ہے کہ مجھے کہانی جاری رکھنے کا خیال ہی نہیں رہا ہے۔
"ابا، باہر کرفیو ہو تو ہم گھر کے اندر کیوں رہتے ہیں؟" میرے بھولے بیٹے کو کیا پتہ کہ کرفیو باہر نہ ہو تو اندر نافذ ہوتا ہے۔ باہر تو بنا چل پھر رہی ہے، مگر پاسترنک کے دروازے پر پہرہ لگا ہوا ہے۔ نہ کوئی ہم کلام نہ ہم خیال۔ پاسترنک اگر لکھ کر نہ بولتا تو اس کا ذہن خیالات سے پھول پھول کر پھٹ جاتا۔ اپنے ذہن کو یوں ہی پھٹ جانے دو ورنہ تمھارے دماغ پر گولی داغ دی جائے گی ــ ارے بھائی، دیکھو میں نے یہ کیا لکھا ہے۔

نہ بابا، ہم تمھاری زبان نہیں جانتے.................. خیر نہ سہی، مگر میں بولے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لو، میں بول رہا ہوں، میری زچگی کا وقت آگیا ہے اگر مجھے روکا گیا تو میرے بدن میں زہر پیدا ہوجائے گا۔ میں اپنے بچے سمیت مرجاؤں گا۔ اے یورپ والے امریکہ والے ایشیا اور افریقہ، میرے ہم زبان مجھے سننے سے انکار کر رہے ہیں، مگر میں بول رہا ہوں۔ تم میری زبان نہیں سمجھتے، مگر پلیز، مجھے سنو! ہمارے منہ میں وہی ایک

زبان ہے۔ مجھے سنو پلیز!

کرفیو!

"ابا کل مجھے باہر لے جائیں گے نا؟"

"ہاں، بیٹا، ہاں، ضرور لے جاؤں گا!"

مگر کل بھی کرفیو ہوگا، پرسوں بھی، ہر روز! میں اپنے بیٹے کی خواہش کیوں کر پوری کر پاؤں گا؟ میں اس کے پُر امید چہرے کی جانب دیکھتا ہوں۔

"ضرور لے جاؤں گا بیٹا!"

مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ میں اپنی چار دیواری میں نہیں ہوں بلکہ اس کمرے کے اندر اپنے جسم میں تنہا پڑا ہوں اور میرا بیٹا لگاتار میرے بدن کے کواڑ پیٹ رہا ہے اور کرفیو کے ڈر سے مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ کنڈی کھولدوں۔

پناہ گاہ

سب چلے گئے تو فتو اور ویرو بھی میلے جانے والے راستے پر دکھائی دیے۔ وہ دونوں اچھل اچھل کر اتنی تیزی سے چل رہے تھے جیسے راستے سے بھی پہلے میلے کے میدان میں جا پہنچنا چاہتے ہوں۔

مرزا انھیں حکیم سلطان شاہ کے چبوترے سے دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگا اور چہرے کی دونوں طرف داڑھی پر انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "چلنا تو صرف جوانی کا ہی ہوتا ہے۔"

"وہ تو ہے مرزے۔" حکیم نے اپنے حقّے پر چلم سیدھی کرتے ہوئے اپنے دوست کو جواب دیا۔ "مگر جوانی کہیں ٹکتی بھی تو نہیں۔"

"یہی تو مصیبت ہے میرے یار۔ بوڑھے راستے اپنی دھول پھانکنے کے لیے وہیں کے وہیں پڑے رہتے ہیں اور جوان لوگ تیز تیز گزر کر نا معلوم کہاں گم ہو جاتے ہیں۔"

حکیم سلطان شاہ نے حقّے کی نے کو منہ سے پرے ہٹا دیا۔ "جوانی کے میلے تو چار ہی دن کے ہوتے ہیں، بوڑھے راستے وہیں کے وہیں نہ ٹھہرے رہیں تو جوانوں کا گھر لوٹنا کیسے ہو؟"

"واہ! کیا پتے کی بات کہی ہے۔" مرزا نے خوش ہو کر حقّے کی نے اپنی طرف کھینچ لی۔

"بخار کی پڑیوں کے ساتھ ساتھ ان باتوں کی پڑیاں بھی بنا بنا کر بیچا کرو۔ ہم زمیندار تو زمین کو پولا کرنے کے سوا کچھ جانتے ہی نہیں۔"

"اب پولا کرنے کے قابل بھی کہاں رہ گئے ہو مرزے؟"

مرزا نے پھر اپنی نظر اٹھا کر فتو اور ویرو پر جمائی۔ "جی چاہتا ہے آنکھوں میں بھر کر ان کی شبیہیں سدا کے

لیے سنبھال لوں ؛

حکیم نے اس کی بات کا جواب دینے کے لیے منہ کھولا تو مرزا کو اس کی آواز پر حقّہ گڑگڑانے کا سا گمان ہوا اپنی شادی سے پہلے جب وہ چوری چوری ملا کرتے تھے تو انھیں کہیں بھی اتنا گھنا اور اونچا گنّے کا کھیت نہ ملتا تھا جو ان کے پیار کو اوٹ میں لے لیتا ۔

•ہاں، شاہ • مرزا کو شاید حقّے کے کش سے نشہ آگیا تھا یا فتّو اور ویرو کے پیار کے تصوّر سے ؛ پیار کرنے والوں کا قد اتنا اونچا ہو تو گنّے میٹھے ہو ہو کر ان کے سروں کے نیچے منھوں تک آجاتے تھے ۔

اب حکیم کی باری تھی کہ حقّے کے کش کا مزہ لے : واہ، میرے یار ! واقعی زمین کو بڑا پولا کر کے بیج ڈالتے ہو تمہارے بول سن کر زندگی بھر چوسے ہوئے گنّوں کا مزہ منہ میں بھر آیا ہے ؛ حقّے کا کش لے کر وہ دھوئیں کا ایک گھونٹ گلے سے کلیجے میں اتار رہا تھا ؛ اپنا دوسرا نکاح تو میں نے صرف اُمّت کی پرورش کے لیے پڑھوا لیا تھا۔ میری ہڈیوں میں ابھی تک میری پہلی مرحوم بیوی ہی کھنکتی رہتی ہے۔ اِسے میں سینکڑوں پھالوں کے عین درمیان سے نکال لایا تھا ــــ نہیں ٹھہرو، ابھی ایک کش اور لوں گا ۔

مرزا نے پھر اس کچے راستے کی طرف نگاہ اُٹھائی جو ڈیڑھ دو کوس پر میلے کے میدان میں جا کھلتا تھا؛ اتنے میں ہی شاید وہ میلے کے آس پاس جا پہنچے ہوں گے ۔

•جوانی آپ ہی میلہ ہوتی ہے مرزے، تمہاری دھندلائی آنکھوں میں کیسے سمجھے؟ یہ لو حلق کو گیلا کر لو۔ اس نے حقّہ اس کی طرف بڑھا دیا؛ اور اللہ اللہ کرو ۔

• میری ساری زمینداری لے لو سلطان شاہ ، پر ایک ایسا کشتہ تیار کر دو کہ سال چھ ماہ کے لیے بدن میں پھر سے جان پڑ جائے ۔

" میں نے کہا ہے نا ، اب اللہ اللہ کرو۔ اس عمر میں جان پڑ گئی تو بدن اور ٹوٹے گا ۔

اسی اثنا میں کلّو میراثی کراہتے ہوئے حکیم کے چبوترے پر چڑھ آیا ؛ داڑھ میں بہت درد ہو رہا ہے۔ حکیم جی ۔

• اور اپنی مراثن کا گڑ کھایا کرو ۔

" سلطان بھی آپ ہو حکیم جی اور شاہ بھی ، آپ ہی نے تو اس بھلی لوک کو کہا تھا اپنے میراثی کو باداموں والا گڑ کھلایا کرو ۔

• ارے مورکھ ، میں نے یہ کب کہا تھا کہ گڑ کھا کھا کر منہ میں کھوڑیں بنا لو ــــ یہ لو دوائی دانتوں پر مل کر سو جانا ۔

• اب اور مجھے کرنا ہی کیا ہے حکیم جی ۔ میراثن تو میلے پر گئی ہوئی ہے ۔

میراثی ان دونوں سے سلام لے کر چبوترے سے نیچے اُترا تو مرزا اپنے دوست سے پوچھنے لگا۔

"کیا یہ سچ ہے سلطان شاہ کہ جب فتو اور ویرو پہاڑی کے پار نکل جاتے تھے تو میراثن اس پار پہرہ دیا کرتی تھی؟"

حکیم سلطان شاہ کو حقے کی آواز سے محسوس ہوا کہ آگ ٹھنڈی پڑ گئی ہے۔ اس لیے مرزا کو کوئی جواب دینے کی بجائے وہ لوہے کا ایک تار لے کر چلم کے کوئلوں کو اوپر نیچے کرنے لگا: "چلم میں دم دینے کا تو تم میں دم نہیں! پھر مرزا کن بیچاری کیوں نہ بجھتی جائے!"

"اچھا کیا مجھے یاد دلا دیا۔ میرے جانے سے پہلے مرزا ان کے لیے پڑیاں باندھ دینا۔"

"ہاں، ہاں رے جانا۔"

حکیم گتے کا ایک ٹکڑا لے کر بجھتی ہوئی آگ پر پنکھا کرنے لگا جس سے کوئلے سلگ سلگ کر گویا اس کی آنکھوں میں چنگارنے لگے: "اب دم میں دم آیا ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے ____"

حکیم نے مرزا کی بات کو پھر نظر انداز کر دیا اور منہ سے دھواں چھوڑتے ہوئے کہا

"تپش جب پانی سے نتھر کر منہ میں آتی ہے تو تمہیں کیا لگتا ہے؟"

"مجھے لگتا ہے کہ گاڑی کی طرح چھک چھک چلنے لگا ہوں۔"

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ دراصل قوت کا شائستہ استعمال بھی یہی ہے کہ سب کی گاڑیاں چھک چھک چلتی رہیں۔"

یہ تو ہے ہی یار میرے، پر میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ ــــ"

"ہاں، سچ ہے۔" پھر اس نے پشت کے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا: "ارے بھی سنتی ہو! مرزا آیا ہے اور کہتا ہے جانے پے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

"السلام علیکم، بھائی رہیں دوپہر کا کھانا بھی یہیں کھاؤں گا۔"

دونوں ہنسنے لگے اور ان کی ہنسی کی آواز سن کر ایک چوہا اپنے بل سے نکل کر ان کے قریب ہی چبوترے پر ناچنے لگا۔

حکیم سلطان شاہ ایک دم سنجیدہ صورت بنا کر مرزا کو بتانے لگا: "میراثن کو فتو بڑا عزیز ہے۔ وہ اس سے کہا کرتی ہے، اپنی عمر سے بیں اگر بارہ ایک برس بڑی ہوتی تو تو میری کوکھ سے ہی جنم لیتا فتو ــــ فتو سے وہ صرف تین چار سال بڑی ہے مگر اپنے بچے کی طرح اس پر نظر رکھتی ہے۔"

ہاں پہلے پہل تو لوگ بے اڑے تھے کہ وہ فتو پر عاشق ہے۔"

"ہاں، کھلی کھلی میراثن ہے، عاشق نہ سہی، بیٹا سہی ــــ پہلے تو وہ ڈر گئی کہ فتو سید مسلمان اور ویرو پکے ہندو، پر پھر اس نے دیکھا کہ انھیں ایک دوسرے کے لیے جینے سے روکا گیا تو وہ جئیں گے ہی نہیں ــــ گاؤں میں

بات کھل گئی تو وہ مجھے بتانے لگی۔ آپ ہی سوچو حکیم جی، ہماری دُنیا میں اتنی کھراب بیماریوں والے لوگ سانس لیتے ہیں پھر بھی اللہ پاک کی ہوا سا ہو کی سا ہو ہے، اور سیتا اور ویرو کے سانس تو اتنے سا ہو ہیں کہ مُردوں میں بھی جان پڑ جائے۔ ہندو اور مسلمان کھامکھا آپس میں بگڑ رہے ہیں، موحبت کرنے والوں کو چُپ چاپ سے جینے دیں ——— حُقّے کا کش لیتے ہوئے حکیم کو رکاوٹ محسوس ہونے لگی تو بات کو ادھورا چھوڑ کر وہ نلی میں پھونکیں ملنے لگا۔

"جب معاملہ عشق کا ہو— سلطان شاہ، تو بات دین کی نہیں، ایمان کی ہوتی ہے۔"

"ہاں، اسی لیے میراثن ڈونگے پانی بر کائی بن کے پڑی رہی کہ کسی کی آنکھ تہہ پر نہ جا پہنچے۔ ہاں، اب حقہ فوارے کی طرح چلنے لگا ہے ——— تو میں بتا رہا تھا کہ میراثن نے ہر تدبیر لڑائی مگر بادو باراں میں کائی کہاں ٹھہرتی ہے۔ بات کھلی اور کھلتے ہی پھیل گئی ——— لو، تمہاری بھابی چائے لے آئی ہے۔"

حکیم کی بیوی نے ان کے سامنے دو گلاس رکھ کے چائے سے لبالب بھر دیئے اور مرزا کی طرف منہ کرکے گویا ہوئی: "آپ اکیلے ہی آجاتے ہیں، ہماری بہن کو ساتھ کیوں نہیں لاتے؟"

"تو آؤں بھابی مگر پتہ نہیں، تمہارے میاں کو کس نے حکیم بنا دیا ہے، دوائی کھا کھا کر اس کی صحت اور بگڑتی جا رہی ہے۔"

"تو پھر ان سے کہیئے، مجھے ہی کبھی وہاں لے جائیں۔"

"آئے دن وہیں ہوتی ہو، میں کیا منع کرتا ہوں؟ ——— میں تو کہتا ہوں تم دونوں وہاں رہو اور میں اور مرزا یہاں۔ ہمیں اب تم لوگوں سے کیا لینا دینا ہے؟"

"لینے دینے کا حساب تو اوپر والے کے پاس پہنچ کر چُک ہی جائے گا۔"

"تو بھلی لوگ، کھاتے میں ہمارا ایک اور حقہ پروستا بھی لکھ لو۔ تمہاری مہربانی ہو جائے تو چائے کے بعد تازہ حقّے کے مزہ آجائے گا۔"

حکیم کی بیوی حُقہ اٹھا کر لوٹ گئی تو مرزا نے ایک بار پھر میلے کے راستے پر آنکھیں ٹکائیں: "راستہ ایسے دم بخود سالگ رہا ہے یار، جیسے ذرا سنبھلتے ہی بھاگ نکلے گا۔"

"دعا کرو مرزا، کہ بوڑھے اور راستے ہمیشہ ٹھہرے رہیں تاکہ نوجوان گمراہ نہ ہوں۔"

"ہاں، وہ تو تم بتا چکے ہو۔"

وہ دونوں اپنے اپنے گلاس پر نظر جمائے سوچ رہے تھے کہ چائے ابھی بہت گرم ہوگی، جوش ذرا ماند پڑے تو اٹھائیں۔ اسی دوران گاؤں کے سرپنچ کنس راؤ کا بھتیجا ان کے سروں پر آکھڑا ہوا: "رام رام حکیم چاچا ——— رام رام مرزا چاچا۔"

"خوش رہو، ٹر گے۔ کیسے آئے؟"

"تائی نے سونف کا عرق منگوایا ہے حکیم چاچا۔ راتو کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔"

"کیسا درد ہے؟"

"جیسا پیٹ میں ہوتا ہے چاچا، اور کیسا!"

"تو یہ لو، سونف کا عرق ہے ـــــ دو پڑیاں دوائی کی بھی لے جاؤ۔"

رتنو کے جانے کے بعد مرزا نے کہا "سلطان شاہ، ابھی تک تو تم ایک لاکھ سے بھی زیادہ پڑیاں گاؤں کے لوگوں کو دے چکے ہوگے۔"

"ہاں مرزے، ایک لاکھ سے بھی اوپر ہوگئی ہوں گی۔ ہر پڑی پر کلمہ پڑھ کرا سے بند کرتا ہوں۔"

"اسی لیے میری مرزائن کہتی ہے کہ مرجائے گی مگر دوائی تمہاری ہی کھائے گی۔ شہر کے ڈاکٹر تو زہر گھول کر دے دیتے ہیں۔"

پتھری سے کنس راؤ کی جان نکل رہی تھی مرزا ـــــ چائے اٹھاؤ، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ اس کا بڑا بیٹا اسے شہر میں آپریشن کے لیے لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے کنس راؤ سے کہا پہلے کلمہ کی تاثیر پرکھ لو۔ خدا نے میرا ساتھ نہ دیا تو پھر چیر پھاڑ کروالینا۔"

"ہاں، اللہ کے فضل سے اب تو منڈوے کے گھوڑے کی طرح اپنے پیچھے سارے گاؤں کی گاڑی باندھے دوڑتا پھرتا ہے ـــــ بھابی نے چائے تو بہت جی جان سے بنائی ہے۔"

"ہمارا سرپنچ بڑا نیک آدمی ہے۔ فتو اور ویرو کی خفیہ ملاقاتوں کی خبر جب اس کے کانوں تک پہنچی تو اسی وقت سارے کام چھوڑ کر وہ یہاں میرے پاس آیا اور بولا، کسی بات کی چنتا مت کرو سلطان شاہ، فتو اکیلے رکھے تیلی کا بیٹا نہیں، ہماری ساجھی دولت ہے۔ پورے سو کوس کے گھیرے میں کوئی ایک تو ہو جو اس سے سر نکالتا ہو۔"

"ہاں، اسے دیکھ کر طبیعت سیر ہو جاتی ہے۔"

"کنس راؤ نے ویرو کے باپ کو بھی یہی سمجھایا تھا کہ بات ہندو مسلمان کی نہیں، بات یہ ہے کہ فتو اور ویرو کی جوڑی کتنی سچی ہے۔ سو ہزار برس بیتتے ہیں تو کہیں اتفاق سے ایسی جوڑی بنتی ہے۔"

"ہاں، بھائی، جوڑی تو ایسی ہے کہ انھیں اکھٹا دیکھ کر میرے کھیتوں میں دگنے دانے پھوٹ آتے ہیں۔"

"ان کی شادی تو انجام پاگئی مگر پنڈت کا لونڈا ابھی تک فرقہ واریت کا زہر پھیلا رہا ہے۔"

"خدا بچائے، نرا فتنہ ہے وہ لونڈا۔ ویرو کو اصل میں وہ اپنے لیے اُڑا لینا چاہتا تھا مگر لونڈیا نے گھاس نہ ڈالی تو اس نے ہندو مسلم کا سوال کھڑا کر دیا۔ لڑکے لڑکی والے دونوں اسی لیے دبکے ہوئے تھے۔ بیچارے سر جوڑ جوڑ کر مشورہ کرتے رہتے تھے کہ انھیں اپنے ارادے سے باز کیسے رکھا جائے۔"

مرزا کی بھاری بھاری سفید مونچھوں میں چائے کی بھوری جھلّی سی پھنس گئی تھی جسے دیکھ کر حکیم بنسنے لگا، ہونٹوں

•

پرانتے بڑے بڑے سفید جھاڑ تو کیا اپنی جھریاں صاف رکھنے کے لیے باندھے رکھتے ہو، اتنی پکی ہوئی داڑھی کیا کم ہے؟"

مرزا نے اپنے کندھے پر سے لٹکتے ہوئے تولیے سے مونچھیں صاف کیں اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا "تم تو جانتے ہی سلطان شاہ، عورتیں مجھے دیکھتے ہوئے گھبراتی تھیں کہ عاشق نہ ہو جائیں۔"

"ہاں یار، تم بھی اپنے فتوے سے کیا کم تھے ___ ارے بھئی" وہ اپنا سر موڑ کر بیوی کو پکارنے لگا "ابھی تک حقہ نہیں ہوا ہے؟"

"نہیں، سلطان شاہ، فتو اور ویرو کے عشق کا تو جواب نہیں۔ اتنا بڑا فساد ہوتے ہوتے رہ گیا، مگر کیا مجال مستوں کے کانوں پر جوں بھی رینگی ہو۔"

"محبت کرنے والوں کے سروں میں اپنی دھن ہوتی ہے، جوئیں نہیں" اپنی بیوی کو حقہ لیے دروازے سے برآمد ہوتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

"دیکھو تمہاری بھابی حقہ بھر وس لائی ہے" اس نے ہاتھ بڑھا کر بیوی سے حقہ تھام لیا۔

"مرزا، میری ساری حکمت تو تمہاری بھابی کے دم سے ہے۔"

"بیٹے، خوشامد مت کیجئے۔" حکیم کی بیوی نے اندر لوٹنے سے پہلے اپنے میاں کو پیار سے دیکھا تو حکیم کا تازہ دم حقہ بے اختیار گڑگڑانے لگا۔

"ہزار آفرین ہے اپنے کنس راؤ پر" حکیم نے مرزا کی جانب جھول کر کہا "جو دونوں کی شادی امن سے انجام پا گئی ورنہ خدانخواستہ گڑبڑ ہو جاتی تو مسلمان تو آٹے میں نمک کے برابر تھے۔"

"مگر آٹے میں نمک رچ بس جاتا ہے سلطان شاہ، تو آٹا نمک سے الگ ہوتا ہے نہ نمک آٹے سے۔"

"ہاں، آپس میں رچنا بسنا ہو جائے تو سبھی کا ذائقہ ایک ہی ہو جاتا ہے ___ لو، اپنی بھابی کا حقہ پی کے کچھ دو ہی گھونٹ میں مسیحائی نصیب ہو جائے گی۔"

مرزا نے حقہ اپنی طرف کھینچ کر منہ سے لگا لیا "واہ ___ ہ ___ ہ! ذہن میں روشنی ہی روشنی ہو گئی ہے سلطان شاہ! ___ کاغذ اور قلم دوات لاؤ تاکہ تمہاری حیاتِ جاوداں کا نسخہ لکھ دوں" ___ اس نے ایک اور لمبا گھونٹ بھرا۔

"واہ ___ واہ" اسی ترنگ میں اس نے اور دو تین بڑے لمبے گھونٹ اندر کھینچ لیے اور بلکے سے توقف کے بعد پھر گویا ہوا "میری آنکھوں سے پردے اٹھ رہے ہیں شاہ" اپنے سامنے دیکھتے ہوئے اس کی نظر اچانک میلے کے راستے پر رک گئی ___ "ارے! ___ وہ راستہ کوئی بری خبر پا کر میلے کی طرف سرپٹ بھاگ رہا ہے۔"

حکیم ذرا سا گھبرا کر مرزا کی طرف دیکھنے لگا۔

"شاید تمباکو تمہارے کلیجے سے جا لگا ہے ۔۔۔۔۔ ارے بھئی سنتی ہو؟" اس نے پھر عقب کے دروازے کی طرف منہ کر کے اپنی بیوی کو پکارا۔ "مرزا کے لیے پانی کا ایک گلاس لاؤ۔" اس نے چلم کو حقے کے منہ سے اٹھا کر ہاتھ میں لے لیا اور لوہے کے تار سے انگاروں میں دبے ہوئے تمباکو کو ٹٹولنے لگا۔

(۲)

راستے میں درخت، جھاڑیاں، کھیت ۔۔۔۔۔ جو بھی آیا، فتو اور ویرو کو آوازیں دے دے کر پکارتا رہا مگر وہ آپس میں اتنے مگن تھے کہ ان کا کسی کی طرف دھیان ہی نہ گیا، مانو دونوں دھن میں پچھلے جنم سے اگلے جنم کی طرف جا رہے ہوں اور زمانۂ حال صرف اس لیے ہو کہ ان کے سفر کا سلسلہ نہ ٹوٹے۔

"ویرو۔" فتو اپنی دلہن کے کانوں میں گنگنا رہا تھا۔ "کل رات تم سو رہی تھیں اور میں تمھیں آنکھوں میں سمیٹے محسوس کر رہا تھا کہ تم کچی مٹی کا کورا چراغ ہو اور سرسوں کے تیل سے لبالب بھری ہوئی ہو اور تمہارا پورا چہرہ ٹھنڈی لاٹ بن کر جل رہا ہے اور ۔۔۔۔ "

"لاٹ ٹھنڈی بھی ہو تیلی کے بیٹے، پر ہوتی تو لاٹ ہی ہے، پھر ہمارا بستر کیوں نہ جل اُٹھا؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور ابھی ان کی ہنسی ہوا میں بج رہی تھی کہ ان کے اوپر سے رنگ برنگے پرندوں کا ایک جھنڈ گزر گیا اور نئے نویلے جوڑے نے کھلے عام ایک دوسرے کو بازوؤں میں لے لیا۔ اسی دوران ان کے پیروں کے قریب سے ایک کالا ناگ گزر گیا مگر انھیں پتہ ہی نہ چلا۔

تھوڑی دیر میں وہ راستے کی بائیں لکیر پر مڑتے ہوئے ایک جنگل میں گھس رہے تھے جسے پار کر کے اسی لکیر پہ انھیں ایک پہاڑی پر جا چڑھنا تھا اور وہاں سے میلے میں کود جانا تھا۔

یہ میلہ کوئی تجارتی میلہ نہ تھا بلکہ یہاں حضرت درویش کے مزار پر ارد گرد کے دیہات سے ہر مذہب کے نوعمر مرد و زن کھانے پینے، ہنسنے اور موج اڑانے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ حضرت درویش مرحوم اپنی آخری عمر میں اپنے نوعمر مریدوں سے گھرے رہتے اور انھیں ہنستے رہنے کی تلقین کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک نوجوانی ہی میں تو بے وجہ ہنسنا بے محل معلوم نہیں ہوتا ۔۔۔۔۔ ورنہ بڑھاپے میں تو سوچ سوچ کر ہنسنا پڑتا ہے۔ ایک حکایت مشہور ہے کہ حضرت نے ساری جوانی غور و فکر میں بتا دی اور اس طویل ریاضت کے بعد انھیں ہنسنے کی خواہش بے تاب کرنے لگی، مگر ان کے چہرے کے اعضا سالہا سال کے مسلسل غور و فکر سے کچھ ایسے سانچے میں ڈھل گئے کہ ذرا سے ہنسنے سے بھی اپنی جگہ سے اُدھڑنے لگتے اور ان کی چیخیں نکل جاتیں، سو انھوں نے یہ راہ نکالی کہ نوعمروں کو ہنستے کھیلتے دیکھ کر ہی اپنی خواہش پوری کر لیا کریں۔ ان کے مزار پر مایوس نوجوان گھنٹوں ہنستے رہتے تاکہ وہ خوش ہو کر ان کی مرادیں پوری کر دیں۔

جنگل میں داخل ہوتے ہوئے فتو نے ویرو سے پوچھا کہ وہ حضرت درویش سے کیا منت مانگے گی۔
"تم مل گئے ہو تو مجھے اور کیا مانگنا ہے۔"
"پھر بھی؟"
"پھر بھی کیا؟ میں تو خوش ہوں ہی، ہنس ہنس کر حضرت کو بھی خوش کر دوں گی۔"
اپنے گرد و پیش جنگل کے بکھراؤ کو دیکھتے ہوئے فتو کو اچانک احساس ہوا کہ وہ اپنے ذہن میں جھانک رہا ہے۔ اس نے ویرو کی کمر کو بازوؤں میں لے کر اپنے ساتھ جوڑ لیا اور گویا اپنے آپ کو بتانے کے لیے بڑبڑایا۔ "دیکھ لوں گا اسے۔"

"کیسے ۔۔۔ ؟ کون ۔۔۔ ؟" وہ تیزی سے اس کے بازو سے نکل کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور بڑھ کے ملی اس کے منہ سے منہ جوڑ لیا، جیسے اس کے جواب کو اندر سے باہر آنے سے پہلے ہی اپنے اندر ڈال لینا چاہتی ہو۔

راستہ ایک طرف مڑ گیا اور یہ چھوٹا سا جنگل لامتناہی معلوم ہونے لگا۔
"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" فتو نے کہا۔ "اپنے حکیم چاچا کا لڑکا یوسف ہے نا، اس نے ایک افواہ سنی تھی کہ وہ پنڈت کا چھوکرا بھروسے میلے میں ادھر ادھر سے کئی نکھٹوؤں کو لا رہا ہے۔"
"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"
وہ ویرو کی ٹھوڑی اوپر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔
"بتاؤ، کیا بتاتا؟ ۔۔۔ یہ کہ مجھے اس مینڈک سے ڈر لگ رہا ہے؟"
ویرو کو اپنا آپ اپنے مرد کی آنکھوں میں ایک کا دو نظر آنے لگا اور وہ اپنا بچہ بھول کر مسکراتے ہوئے اپنے انگوٹھے کے ناخن سے اس کے نئے کرتے کا کاج ٹھیک کرنے لگی۔
"ابھی تک میں اس کا دماغ ٹھکانے پر لگا چکا ہوتا، مگر سرپنچ کو وچن دے چکا ہوں کہ لڑائی جھگڑے سے بچا رہوں گا۔"
"بچنا ہی ٹھیک ہے۔"
"کیا ٹھیک ہے؟ جان بوجھ کر ہندو مسلمان کا ہوا کھڑا کر کے ڈراتا رہتا ہے ۔۔۔ تم گھبراؤ نہیں۔ اگر وہ گڑبڑ پر تل گیا ہے تو اسے دیکھ لوں گا۔"
"دیکھنا تو میں اسے آپ ہی لوں گی ۔۔۔ کل میں بھابھی کے گھر سے آ رہی تھی تو تالاب کے پاس مل گیا اور اکیلی پا کر بکواس کرنے لگا مگر میں نے اسے خوب سنائیں۔ میری طرف بڑھنے لگا۔ میں نے اس سے پہلے ہی اس کی طرف چار قدم بڑھا کر کہا۔
"ہمت ہے تو چھو کے دکھاؤ۔"

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"
"کیا بتاتی؟ ـــــ کہ اس مینڈک سے ڈر لگتا ہے؟"
دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور قہقہانے لگے۔ اور قریب ہی کہیں جھاڑیوں میں بیٹھا ہوا بندروں کا ایک غول ان کی شاداں غرّاہٹیں سن کر بھاگ کھڑا ہوا۔
ذرا سے میں ہی وہ جنگل کے اس آخری کونے کے پاس آ پہنچے۔
"میں سوچتی ہوں تو......"
"سوچ سوچ کر کیوں اپنا تیل نکالتی رہتی ہو؟"
"تمہیں تو تیل کے بغیر کچھ سوجھتی ہی نہیں ـــــ نہیں ـــــ نہیں، پہلے میری بات سن لو ـــــ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری جوڑی بہت سندر ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ ہم بے حد بدصورت ہوتے اور ہم ایک دوسرے کو ساری دنیا سے خوب صورت لگتے۔"
وہ جنگل سے باہر نکلے تو سارا جنگل جیسے ان کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے ان کے عقب میں چھپ کر انھیں دیکھا رہ گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے پہاڑی کی چوٹی پر آ گئے اور جونہی آئے توں ہی میلہ ان کے دل و دماغ سے لڑھک کر یہاں پہاڑی کی اس جانب جا لگا۔

(۳)

میلے کے منہ پر ہی ایک کوہ قاف جھولا تھا جس کی گولائی میں دو سیٹوں والے پنگوڑے برق رفتاری سے اوپر نیچے گھومتے ہوئے ایک مہا چکر کا منظر پیش کر رہے تھے۔
فتو اور دیر تھوڑی دیر پہلے اسی چکر میں اوجھل ہو گئے تھے اور ایک دوسرے کو اپنے اپنے وجود سے کس کر محسوس کر رہے تھے کہ وہ آپ ہی آپ یک قالب اپنی گولائیوں میں گھوم رہے ہیں۔ ان کی مسرت آگیں چنچیں انھیں چاروں طرف سے بکھر کر گرنے سے بچائے ہوئے تھیں۔ مگر وہ چاہ رہے تھے کہ چنچیں انھیں چھوڑ دیں اور وہ مسرت سے چکنا چور ہو جائیں اور یک روح آسمان کی سیر کو نکل جائیں۔
جھولے سے اتر کر وہ دونوں ابھی تک گویا جھولے میں ہی گھوم رہے تھے کہ انھیں اپنی میراثن نظر آ گئی جو برف کا لال گولا چوس رہی تھی۔
"بھابی!"
انھیں دیکھ کر میراثن کی باچھیں کھل گئیں ـــــ "او ـــــ یہاں آؤ!"
وہ انھیں بلاتے ہوئے ان کے قریب آ گئی اور انھیں بھی برف والے کے پاس لے آئی۔ "لاؤ بھائی،

ان کے لیے بھی دے دو۔ چار چار آنے کے حساب سے دو۔ ہجرت درویش کا میلہ ہے۔ بر پچھو کو بھی آگ لگا کر بجھوگے تو تمہارا بھلا کیسے ہوگا! لو، پورے بارہ آنے ہیں، گن لو۔"

"بھابی۔"

میراثن چڑی ہوئی شکل بنا کے فتو کی طرف دیکھنے لگی: "ماں کو بھابی کہتے ہوئے شرم نہیں آتی! میں نے تو اپنا بیٹا نہیں جنا کر تو جو ہے" میراثن نے زمین سے ذرا سی دھول اٹھا کر ویرو کے گال پر لگا دی "بہو اتنی اچھی دکھ رہی ہے، میری موئی نجر نہ لگ جائے۔"

"بھابی ــــ نہیں، ماں ــــ نہیں، مجھ سے تم دو ایک سال ہی بڑی ہوگی یا شاید چھوٹی ہی ہو۔ میں تمہیں ماں کیسے کہوں؟"

"کہو گے تو تمہارے بڑے باپ کے تیل سے اپنا سر تو نہ تھڑ لوں گی میرا سارا لینا دینا تو تم سے ہے۔"

"ہمارے بڑے بھائی کو اکیلا ہی چھوڑ آئی ہو!"

"ہاں، میراثی کو کھا بھائی بناؤ، کھا بیٹا، پر میں تمہاری ماں ہوں۔"

"پر اُسے اکیلا کیوں چھوڑ آئی ہو؟"

"اکیلا کہاں چھوڑ آئی ہوں! اس کا نا رہ کا درد جو اس کے ساتھ ہے۔ اسی کا نام لے کر مر رہا تھا، سو میں نے کہا، میرا کیا ہے، مرد ــــ اور اپنے بیٹے کی چھب دیکھنے یہاں چلی آئی۔"

برف والے نے فتو اور ویرو کو گولے تھما دیے تو میراثن ان سے کہنے لگی

"آؤ تمہیں اب کسمت والی چڑیا دکھاؤں۔ ویرو کی کسمت مالوم کریں گے ــــ آؤ میرا تو سارا حال اُس نے کھول کر بتا دیا ہے۔ ساس تراں پنجے جما جما کر پنجرے سے نکلتی ہے جیسے سوچ سوچ کر آنے والوں دکھتوں میں اکھل رہی ہو اور سیدھی اسی کاگت پر جا کھڑی ہوتی ہے جس پر کسمت لکھی ہو ــــ آؤ ــــ یہ ہے ــــ یہ لو چونی، بھائی۔ اپنی چڑیا سے کہو کر ہماری بہو کی کسمت بتائے۔"

پنجرا کھلتے ہی رنگدار چڑیا دھیرے دھیرے باہر آئی ادھر ادھر دیکھا اور چوں چوں کرتی ہوئی ایک کاغذ پر ویرو کے نوشتہ پر آ کھڑی ہوئی۔

چڑیا والا کاغذ اٹھا کر پڑھنے لگا۔

"چار شبدہی لکھے ہیں بی بی، پر چار تو لے سونے سے کم نہیں۔ سن کر چڑیا کو ایک چونی اور دے دوگی ــــ لکھا ہے، اپنے پیاروں کا پیارا۔"

فتو بڑے پیار سے اپنی دلہن کی طرف دیکھنے لگا۔ مگر اسی اشارہ میں کسی نے چڑیا والے کی طرف ایک دونی پھینک کر کہا: "یہ لو، دوسری چونی ہم سے لو۔"

فتو نے آنکھیں گھما کر دیکھا کہ پنڈت کا بیٹا بھر دے ماتھے پر تلک جمائے اپنے مشٹنڈے

ساتھیوں کے ساتھ کھڑا کھی کھی کر رہا ہے۔ وہ میان میں سے برآمد ہوتی ہوئی شمشیر کی طرح تند اور تابناک ہو اُٹھا۔

"اپنی چوٹی اُٹھا کے سب کے سامنے معافی مانگو بھر دے، ورنہ۔"

"ورنہ کیا مسٹلے! ۔۔۔ ہماری برچھ پر کبھا کرکے ہم ہی کو دیے دکھاتے ہو۔"

"تمہاری چیز پر ۔۔۔" فتّو نے بے قابو ہو کر پاس ہی سے نہ جانے کس کی لاٹھی کو جھپٹ کرلے لیا اور جب ان کی طرف لپکا تو قسمت والی رنگدار چڑیا پنجرے کا دروازہ کھلا پاکر پھُر سے اڑگئی۔

(۴)

وہی ہوا جو نہ ہونا چاہیے تھا۔

فتّو اور ویرو کے دم توڑتے ہی یوسف اور اس کے چند ساتھی بھی آ پہنچے اور بھرو سے اور اس کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے، اور جب بھرو سے دم توڑ رہا تھا تو ہندوؤں کے ایک گروہ نے مسلمانوں کو آلیا ۔۔۔ اور جو ہندو اور مسلمان اس دنگے کو ختم کروانا چاہتے تھے۔ وہ اپنی اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے اور سمجھنے لگے کہ دوسرے فرقے کے لوگ انہی پر حملہ کرنے کے لیے دوڑے آ رہے ہیں اور اس طرح وہ بھی ایک دوسرے سے بھڑ گئے میلے کا میدان دیکھتے ہی دیکھتے خون میں لت پت ہوگیا ۔۔۔ ہندو اور مسلمان تو لڑتے رہے مگر ان کے خون کی لکیریں زمین پر بہہ بہہ کر یکجا ہوتی رہیں۔

اور جانور حیوان کی بیل گاڑیوں اور یکّوں کو کھینچ کھینچ کر انھیں یہاں لائے تھے، اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو جھپکے بغیر چپ چاپ انسان کی بربریت کا تماشہ کرتے رہے اور شاید حیران ہوتے رہے کہ بھوک مٹانے کے لیے ملنا ضروری ہی ہے تو جسے مارتے ہیں پہلے اسے تو کھالیں، یہ تو مارتے ہی چلے جارہے ہیں اور کوئی کسی کو کھاتا بھی نہیں!

اور ۔۔۔ اور کئی عورتیں ۔۔۔ میراثن بھی۔ حضرت درویش مرحوم کے مزار سے لپٹ لپٹ کر پاگلوں کی طرح ہنسے جارہی تھیں۔

(۵)

افواہوں کے پر ہوتے ہیں نہ پیر، پھر بھی کہاں کہاں نہیں جا پہنچتیں؟ بات کرنے والے کا کوئی پتہ ہی نہ چلتا تھا، بس یہ سمجھ لیجیے کہ باتیں آپ ہی اپنے آپ کو پھیلائے جارہی تھیں۔ ایک یہ بھی کہ حضرت

درویش سبھی مسلمانوں کے خواب میں آ کے انھیں چوڑیاں پیش کر رہے ہیں۔ ایک اور یہ کہ مسجدوں میں مسلمانوں
نے قسمیں لی جا رہی ہیں کہ ہر ایک کم سے کم دس کا صفایا کرے۔ اور کئی اور تھیں جو آسیبوں کے مانند بے پرانی
لاشوں پر پھڑپھڑا کر ہیبت کا سماں باندھ رہی تھیں۔

سرکار نے حضرت درویش کے مزار کے آس پاس سبھی دیہاتوں میں بڑا سخت کرفیو نافذ کر رکھا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر
پر بارہا اعلان کیا گیا کہ کرفیو میں جو بھی گھر سے باہر نظر آئے گا اُسے گولی سے اڑا دیا جائے گا۔ شرپسندوں نے پھر بھی جو
کرنا تھا اپنے بچاؤ کی تدبیر کر کے برابر کرتے رہے مگر بھولے بھالے لوگ خواہ مخواہ آوازیں دے دے کر موت کو بلاتے
رہے۔ کنس راؤ کی سالگرہ کا دن تو تھا۔ لیکن اپنی موت کے دن کسی کے پیدا ہونے کے دن کا خیال کیسے آتا ہے؟
لیکن میراثی نے ہنس کر کہا، کر کھیو کا میں نے کیا بگاڑا ہے جو میرا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے گا۔ لالہ سے اپنا
انعام وصول کر کے ابھی لوٹ آؤں گا۔

"جا کہے تو جاؤ، میری جان کیوں کھا رہے ہو؟" فتو اور ویرو کے قتل کے بعد سے میراثن کے ہوش
ٹھکانے نہ رہے تھے۔ ورنہ وہ جو کام اپنے مرد کے لیے ٹھیک نہ سمجھتی تھی مار پیٹ کر بھی وہ اسے اس کام سے روک
لیتی تھی۔

جنھوں نے گولیوں کی آواز سنی تھی اُن کا کہنا تھا کہ فوجی نے پہلی بار ہالٹ کہا تو میراثی تیز تیز چلنے لگا،
دوسری بار کہا تو اس نے دوڑنا شروع کر دیا اور تیسری بار فوجی کی ہالٹ سن کر اتنی تیزی سے دوڑنے لگا کہ فوجی نے
گولیوں کی بوچھار کر دی۔ کسی کو اس کی ہائے کی آواز بھی سنائی نہ دی۔ میراثن کو یہ خبر سنائی گئی تو پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ
دا یا پھر شاید آیا، یا شاید نہ آیا اور اس نے سر جھکا کر چپ سادھ لی۔ ایک بار اسے بتانے کی کوشش کی گئی تو وہ چلا
کر کہنے لگی۔

"ہاں، ہاں، سن لیا ہے، اتنی بڑی بیماری پھوٹ پڑی ہو تو سبھی کو باری باری مرنا ہی ہوتا ہے۔"

مگر اسی شام وہ پڑوس میں جا کے رونے لگی۔ "میں اپنے اس موئے مراثی کو کہاں سے ڈھونڈوں؟ سویرے کا گیا
ہوا ہے، ابھی تک نہیں لوٹا۔"

اس سارے علاقے میں سفید کبوتر بہت تھے۔ غنڈے من مانی کر کے صاف بچ نکلے تو فوجی اپنی بندوقوں کو
آسمان کی طرف گھما کر ان سفید کبوتروں کو ہی گرانے میں لگ جاتے اور کبوتر پھڑپھڑاتے ہوئے اُن کے قدموں میں آ گرتے
پر وہ فتحیاب مستعدی سے مارچ کرتے ہوئے انہیں روند کر جلے ہوئے کچے مکانوں کے ملبوں کی طرف آگے بڑھ جاتے۔

جب فسادات کی روک تھام کے دوسرے طریقے کارگر نہ ہوئے تو حکومت نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے
لیے تیس پینتیس میل کے فاصلے پر راجدھانی کے قریب ایک گاؤں میں کیمپ کھول دیا جائے۔

ٹاٹا پور گاؤں سے قافلے کی روانگی کی تیاری ہو رہی تھی کہ کنس راؤ سرپنچ اور گاؤں کے چند دوسرے ہندو بزرگ
انھیں وداع کرنے کو آئے۔ پہلے تو فریقین ایک دوسرے کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے رہے اور پھر گلے مل مل کر رونے لگے۔

"میں بہت شرمندہ ہوں سلطان شاہ" کنس راؤ نے کہا "مجھ سے کچھ بھی بن نہ پڑا۔"

"ہر شریف آدمی شرمندہ ہے لالہ" حکیم سلطان شاہ نے فقیروں کے سے عجز سے کہا اور کنس راؤ کا سہارا لینے کے لیے اس کے کندھے پر اپنا بوڑھا ہاتھ ٹکا دیا "غیر شریفوں کا کیا شریف ہی بھگتتے آئے ہیں" پھر اچانک کچھ یاد آنے پر اس نے اپنی شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالا "لالہ! رتن لال کی بیماری لمبی ہے۔ یہ میں پڑیاں بنا لایا تھا کہ کوئی مل گیا تو اس کے لیے دے دوں گا۔ اس سے کہنا ویسے ہی مکھن کے ساتھ ایک پڑیا ہر روز کھاتا رہے" و مرحبغ نے پڑیاں اپنی جیب میں رکھ لیں "مجھے تو لگ رہا ہے شاہ کہ ہمارے باپ دادا ____ سبھی مرے ہوئے بزرگ آپ لوگوں کے ساتھ ہی گاؤں سے جا رہے ہیں"

رکھے تیلی کے بڑھے باپ کے پوپلے منہ سے بے اختیار نکل گیا "مگر لالہ، اپنے بچے تو ہم یہیں قبرستان میں چھوڑے جا رہے ہیں۔ اُن کا خیال رکھنا"

کنس راؤ نے بوڑھے تیلی کا دکھ محسوس کر کے جواب دیا "میرا تو جی چاہتا ہے بھائیا، اپنے ہی پیٹ میں چھرا گھونپ کر بندوں سے تمہارا بدلہ چکا دوں"

اسی اثنا میں فوجی بگل نے قافلے کی روانگی کا اعلان کیا اور عین اسی وقت قافلے میں عورتوں کی ٹکڑی سے میراثن کی سراسیمہ آواز آئی۔

"ہائے میں اپنی گائے تو کھونٹے پر ہی بھول آئی ہوں"

"گائے ہی تو ہے" مرزائن اُسے سمجھانے لگی "یہ وقت اپنی جان بچانے کا ہے"

"نہیں میرے لوگ اس بے جان کو بھی ختم کر دیں گے"

میراثن ابھی مُڑ مُڑ کے دیکھ ہی رہی تھی کہ دوسرے فوجی بگل کے ساتھ ہی قافلہ روانہ ہو گیا۔

"لکھی ــ ی ــ ی!" میراثن نے چیخ کر اپنی گائے کو پکارا اور قافلے سے نکل کر ننگے پاؤں بے سدھ بھاگنے لگی۔

(۶)

میراثن کی چیخ ابھی تک ان کے کانوں میں گونج رہی تھی اور زمین پر ان کے پاؤں اتنے ہلکے پڑ رہے تھے گویا وہ اپنے اپنے وجود کی بجائے خیال ہی خیال میں ساجی رہے ہوں سارے قافلے میں زندگی اور حرکت کا احساس صرف فوجی جوتوں کی ٹھپ ٹھپ سے ہو رہا تھا۔

حکیم سلطان شاہ کے قریب آ کر مرزا اس کے کان میں کہنے لگا "راستے بھی ہمارے ساتھ بھاگ رہے ہیں سلطان شاہ"

"کیا ؟" حکیم کی بھری ہوئی آنکھوں میں اپنے بیٹے یوسف کی لاش ڈوبی ہوئی تھی۔
"میں نے کہا، بچھڑے ہوئے راستے بھی ہمارے ساتھ چلتے آ رہے ہیں۔"
حکیم نے ایک بڑی لمبی ٹھنڈی سانس لی۔
"جب بڈھوں کا ہی ٹھہرنا نہ ہو مرزے تو بستیوں کے راستے بھی کیوں ٹھہرے رہیں؟"
"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ انھیں سنبھال کر ساتھ ساتھ رکھو، ورنہ واپس کیسے آئیں گے؟"
حکیم نے ہاری ہاری ہنسی ہنس کر کہا "سنبھال کے ؟ سچ پوچھو مرزے تو یوسف کے جانے کے بعد اب کچھ بھی سنبھال کے رکھنا عبث معلوم ہوتا ہے۔"
"حوصلہ رکھو، حکیم۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔"
"ہاں مرزے، اللہ سب سے بڑا ہے۔"
وہ کافی دیر خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور پھر ایک دم مرزا نے اپنی گردن حکیم صاحب کی طرف بڑھا کر کہا: "سلطان شاہ، ایک راز کی بات بتاؤں۔"
حکیم نے اپنے کان کھڑے کر لیے۔
"ابھی ابھی حضرت درویش مرحوم میرے ساتھ ہی چل رہے تھے اور مجھے بتا رہے تھے کہ میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنا مقام چھوڑ کر تمہارے ساتھ ہی ہو لوں۔ ہرچہ بادا باد!"

(۷)

پورے ایک ہفتے کی تلاش کے بعد کنس راؤ میراثن کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے آدمیوں نے شام کے وقت اسے میراثی اور فتو کی قبروں کے پاس گھٹنوں میں سر دیئے اپنے وجود کی قبر میں زندہ پڑے ہوئے دیکھ لیا۔
"اری او میراثن! ___ میراثن!"
میراثن نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔
"بہت ہو گیا بھائیو۔ اب میری جان چھوڑ دو۔"
"چلو، ہمارے ساتھ چلو۔"
"نہیں، دونوں نہیں، صرف ایک!" اس کی نظروں میں گڑگڑاہٹ تھی: "کلمہ پڑھ کے کوئی ایک تو مجھے لے جاؤ۔ پھر آدھے گھنٹے کے بعد طلاق دے دینا۔"
"کیسی باتیں کر رہی ہو؟ چلو تمہیں سرغنہ نے بلایا ہے۔"

سرپنچ سے مل کر پہلے تو میراں کی روتے روتے گھگی بندھ گئی۔ پھر غبار ہلکا ہوا تو بتانے لگی۔ بڑے بدمعاش لوگ تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ مجھے لکھی کے پاس لے جائیں گے، پر تمہیں کیا بتاؤں، مجلیوں نے میری عزت کی بہت لوٹ مچائی۔ میراں بیچارہ میری پھکر کر کے کبر میں اپنا ڈاڑھ کا درد بھول گیا ہوگا۔

سرپنچ کا دل اتنا بھاری ہو رہا تھا کہ اسے اپنی ہلکی سی مسکراہٹ کا احساس بھی نہ ہوا۔

"لالہ، میں نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر منت کی، تو مجھے میرے لوگوں کے پاس پہنچا دو۔ پاپیوں نے ہنس کر جواب دیا۔ تمہارے لوگوں کو تو پاکستان بھیج چکے ہیں، اتنے سال سے پاکستان بھی سنبھالے بیٹھے تھے اور ہماری چھاتی پر بھی مونگ دل رہے تھے۔ پاکستان کون سا گاؤں ہے لالہ؟ کیا تم مجھے ان کے پاس پہنچا دو گے؟"

سرپنچ نے اسے دلاسہ دیا "ہاں، پہنچا دوں گا۔ اب تم سو جاؤ۔"

"میرا فتو کہا کرتا تھا تم دل کے سچے مومن ہو۔ میری لکھو کو بھی ڈھونڈ نکالو۔"

"ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔ اب تم سو جاؤ۔"

میراں کو سات دن میں پہلی بار کھلا کھلا آزادی کا سونا ملا تو سوتے سوتے اسے ساری رات محسوس ہوتا رہا کہ دوزخ کی آگ سے نکل کر بارش میں بھیگ رہی ہے۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو غنڈوں کی ہوسناک پھنکاریں اس کے بدن سے بخار کے ذریعے خارج ہو رہی تھیں۔ سرپنچ نے سوچا کہ ضرورت ہوئی تو کیمپ میں ہی علاج کروا لیں گے اور اسے سرکاری جیپ میں اپنے ساتھ بٹھا کر ڈرائیور کو چلنے کی ہدایت کی۔

(۸)

میراں بارہ گھنٹے کیمپ کے اسپتال میں پڑی رہی، اور تھوڑا ہوش میں آتے ہی اس نے پانی مانگا۔ ڈاکٹر اسی دم اس کی طرف متوجہ ہوگیا اور گلاس بھر کر اسے نہایت محبت سے پانی پلانے لگا۔

"چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرو، ماں۔"

میراں کا پھنکا ہوا کلیجہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے ٹھنڈا ہونے لگا اور اس نے اپنی ملائم سی نظر بجلی کی دھیمی روشنی میں نوجوان ڈاکٹر کے چہرے پر ٹکا لی۔

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"میں یہاں ڈاکٹر ہوں، ماں۔"

"میرا فتو بھی بالکل تمہاری تراں اونچا لمبا تھا — تمہارا نام کیا ہے؟"

"نند کشور، ماں۔"

ڈاکٹر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا بخار محسوس کرنے لگا۔

"حکیم ساب کو کھبر کر دو بیٹا، میں بھی پاکستان آ پہنچی ہوں۔"

...

تیسری دُنیا

السلام علیکم! — آپ کے ساتھ بیٹھنے میں مجھے کوئی عذر نہیں مگر میں کہیں بیٹھ جاتا ہوں تو لوگ میری داستان سنتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور مجھے شرمندگی ہونے لگتی ہے، میں کیسا مہمان ہوں کہ میرے میزبان مجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنے ہی گھروں سے باہر ہو لیتے ہیں — لیجیے، بیٹھ گیا — پیرانہ سالی سے برا حال ہے کہیں بیٹھ جانے کا حیلہ مل جائے تو خدا کا شکر بجا لاتا ہوں ورنہ کبھی وہ وقت تھا کہ لوگ باگ پیچھے سے آوازیں دے دے کر روک لینا چاہتے تھے مگر میں ہمیشہ آگے کی آوازوں کی جانب رواں دواں ہوتا تھا — السلام علیکم — آیئے آپ بھی بیٹھ جایئے۔ میں نے ابھی اپنی داستان شروع نہیں کی۔ دراصل میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اپنی داستان کی ابتدا کہاں سے کروں۔ بڑھاپے کی یہی ایک مصیبت ہے کہ ساری کی ساری عمر آدمی کے سامنے کھڑی ہو کے اُس کے مُنہ چڑاتی ہے اور وہ لٹھ لیے کے کھانستے ہوئے اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ کیا مجال، جو بے جائے کے ہاتھ اس کا بازو، کندھا، سر یا پاؤں آجائے — جو بیت گئی وہ بیت گئی — مجھے تو لگتا ہے کہ جو بھی مجھ پر بیتی ہے، وہ مجھ پر نہیں بیتی — کیوں پر بیتی۔ جو ایک کے بعد ایک روپوش ہوتے گئے۔ اب کس مُردے کو کھود کر کھڑا کروں کہ آؤ بھی، پہلے شہادت دو — ہاں، مجھے معلوم ہے آپ اَن ہونی باتوں کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ شہادت کے بغیر ہی سبھی واقعات پر باور کر لیتے ہیں۔ لیکن آپ نے داستان سنتے ہوئے محض وقت کاٹنا ہوتا ہے، مجھے تو وقت جھیلنا ہوتا ہے جسے جھیلنا ہو وہ مری ہوئی شہادتوں کو بھی اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کا جتن کرتا رہتا ہے، کہ کسی طرح جھیلنے سے بچ جائے — لیکن جھوٹ یا سچ کے محض اعلان سے کوئی بھوکا کب نہ مرتا ہے، سچائی کی شہادت کی صورت تو جھیلتے چلے جانے سے ہوتی ہے۔ بڑی مشکل کا سامنا ہے مگر کیا کیجیے؟ السلام علیکم! بیٹھیے، میں نے ابھی اپنی داستان شروع نہیں کی — کسی کو کسی

ہد کی داستان سُنانا ہو تو وہ ایک ہی بے لاگ لمحے میں اسے فر فر بیان کر دیتا ہے۔ داستانیں اوروں کی سُنائی جاتی ہیں لیکن میں ہمیشہ اپنی ہی داستان سُنانے پر مصر ہو جاتا ہوں اور کہیں سے شروع ہو کر کہیں اور ہی آنکلتا ہوں ــــ نہیں، میری جوانی میں ایسے نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت تو میں کوئی بات شروع کرنا چاہتا تھا تو میرے کچھ کہے بغیر بات خود آپ ہی اپنے آپ کو اُٹھا لیتی تھی اور میں اُس سے خفا ہو جاتا تھا کہ اپنے آپ کو خود آپ ہی بیان کرنا تھا تو مجھے کیوں خواہ مخواہ بیچ میں لے لیا ــــ جوانی کی باتیں چھوڑیے، اتنی خالی ہوتی ہیں کہ باتیں کرنے والا یہاں کھڑے کا کھڑا رہ جاتا ہے اور اس کی باتیں غباروں کے مانند اپنے آپ بھر بھر کر وہاں آسمان میں پہنچی ہوتی ہیں ــــ مسئلہ اس وقت درپیش ہوتا ہے جب آپ پیری میں بیان کی ذمہ داری قبول کریں۔

پیری میں آپ کو اپنی آواز اتنی وزنی معلوم ہوتی ہے کہ آپ اسے دل و دماغ سے اُٹھا کر منہ تک بھی نہیں لا پاتے۔ میری عمر؟ آپ یقین نہیں کریں گے کہ جب میں پیدا ہوا اُس وقت پورے ایک سو دو برس کا تھا پھر یہ ہوا کہ میری عمر ہر سال کے بعد ایک ایک سال کم ہوتی گئی اور اس طرح آج پورے ایک سو دو برس بیت چکے ہیں، یعنی اپنی عمر کے حساب سے مجھے جتنا بھی جینا تھا، جی چکا اور اب جو جی رہا ہوں اپنی عمر کے اوپر جی رہا ہوں ــــ میں تو بہت بوڑھا ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ ہر شخص ــــ بچہ یا بوڑھا ــــ ہر دم اپنی عمر کھا پی کر اس سے اوپر ہی جی رہا ہوتا ہے۔ آپ میری لمبی عمر اور صحت کا راز جاننا چاہتے ہیں؟ راز دار کیا، بس اس لیے نہیں مرا کہ ابھی میری داستان ادھوری ہے ــــ پھر بھی کیا؟ صحت بھی کوئی راز کی شے ہے۔ میری ساری زندگی کھُلے کھُلے ہی گزری ہے۔ اچھی خوراک؟ ــــ اچھی خوراک کیا ہوتی ہے؟ جو بھی جب ملا اللہ کا شکر ادا کر کے کھا لیا ــــ اور نہ ملا تو ــــ ؟ ــــ ہاں نہ ملے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنا عزم کھا رہے ہیں ــــ ہاں، عزم کھانے سے پیٹ تو بھر جاتا ہے مگر آسے کھاتے ہوتے دانت ٹوٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے ــــ ہاں، پیٹ بھر جانے کے باوجود بھوک نہیں مٹتی۔ السلام علیکم! ــــ کیا آپ بھی میری داستان سننے آئے ہیں؟ آیئے ابھی میں نے اپنی داستان شروع نہیں کی ــــ نہیں، میں ٹال مٹول سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ مجھے اپنی داستان تو سُنانا ہی ہے۔ کسی نئے مقام پر اپنی ساری گذشتہ داستان کھول کر نہ سُناؤں تو یہی لگتا ہے کہ ابھی پرانے مقامات سے نکلنا نہیں ہوا اور جہاں آیا ہوں وہاں ابھی نہیں پہنچا ــــ مگر عجیب بات ہے کہ جوں جوں ابد کی طرف قدم اُٹھ رہے ہیں توں توں اپنا ازل ذہن سے محو ہوتا جا رہا ہے۔ بس اتنا یاد ہے کہ ایک پیغام لے کر چلا تھا ــــ نہیں، نظم میں ہوگا ــــ ہاں، نظم میں ہی تھا، کیوں کہ میں اُسے گنگنایا کرتا تھا اور گنگناتے ہوئے مجھ پر رقت طاری ہو جاتی تھی اور میں رونے لگتا تھا۔ میری ماں اُسی دم اچھل کر مجھے گود میں لے لیتی اور اپنا پستان میرے منہ میں ٹھونس دیتی اور اُس کے دودھ کی بوندوں کو حلق میں ٹپکتے ہوئے محسوس کر کے میں روتے روتے مسکرانا شروع کر دیتا ــــ نہیں، تفصیلات مجھے یاد نہیں مگر مجھے یقین ہے کہ ایسے ہی ہوتا ہوگا ــــ ہاں، وہ پیغام ۔۔۔ اہم تھا، نا معلوم کس نے دیا تھا؟ ــــ اور کس کے نام تھا؟ ــــ ہاں، مجھے یہ احساس ضرور ہے کہ

وہ پیغام بہت اہم تھا۔ کئی بار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ذہن پر پورا زور ڈالتا ہوں کہ کم سے کم اتنا ہی یاد آ جائے
کہ پیغام دینے والا کون تھا، یا یہ نہیں تو کم سے کم یہ، کہ مجھے وہ پیغام کس کے پاس پہنچانا تھا۔ شاید اسی سے پتہ چل
جائے کہ وہ کہاں سے کس پیغام کا انتظار کر رہا ہے۔ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا ہوں، مگر سبھی میری طرف اس
طرح دیکھتے ہیں گویا کوئی پاگل بول رہا ہو ــــ السلام علیکم! آیئے، ابھی میں نے اپنی داستان شروع نہیں کی ــــ
ٹھہرے ــــ نہیں ــــ کہیں آپ ہی تو وہ نہیں؟ کیوں کہ عین وقت پر وہی پہنچا ہے جس کا ہمیں انتظار ہو ــــ
کیا آپ کہیں سے کسی نہایت اہم پیغام کی راہ تک رہے ہیں؟ ــــ ہاں ــــ! ــــ دیکھا آپ نے؟ جس
کا ہمیں انتظار ہوتا ہے وہ عین وقت پر پہنچ جاتا ہے ــــ ہم خواہ مخواہ مایوس ہو جاتے ہیں ــــ واہ صاحب
واہ! آپ کو پورے ایک سو دو برس سے ڈھونڈ رہا ہوں ــــ نہیں، یوں نہیں، یوں کیسے کہ جب آپ پیدا ہوئے
تو آپ اکیاون برس کے تھے، یعنی میرے اکیاون برس رہ گئے تو آپ پیدا ہوئے ــــ ہاں، صاحب، اپنی
پیدائش سے پہلے تو آپ ملنے سے رہے ــــ لیکن نہیں ایسے بھی نہیں۔ ایک دفعہ واقعی میرا ایک ایسے گداگر سے
ملنا ہوا جو ابھی پیدا نہ ہوا تھا۔ میں نے بھی آپ کے مانند اس کی بات کو ہنس کر ٹال جانا چاہا مگر وہ بڑی متانت
سے گویا ہوا کہ زندگی بھر میری ایک بھی خواہش پوری نہیں ہوتی تو میں پیدا کیسے ہو گیا! میں سراسیمہ سی تضحیک سے
اس کی طرف دیکھنے لگا تو وہ بولا، اگر آپ کو اطمینان کرنا ہو تو یہاں بڑی سے بڑی آگ بھڑکا کر ایک طرف کھڑے
ہو جایئے اور دیکھیے میں کس طرح ذرا بھی جلے بغیر اس میں سے نکل جاتا ہوں۔ آدمی تو خواہش پوری ہونے سے وجود
میں آتا ہے، جس کا وجود ہی نہیں اُسے آگ کیا جلائے گی! ــــ میں نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھا
تو محسوس ہوا کہ وہ قہقہے لگا رہا ہے مگر ان قہقہوں کی آواز مجھے سنائی نہ دے رہی تھی ــــ نعوذ باللہ! اس اکیلے
راستے سے بھاگ کر میں نے ایک شاہراہ پر پہنچ کر دم لیا ــــ خیر، یہ قصہ چھوڑیے۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ آپ
پیدائش سے پہلے آپ مجھ سے کیونکر مل سکتے تھے ــــ ٹھیک ہے، ملنا تو پیدائش کے بعد ہی ہوتا ہے،
لیکن پیدائش کا انحصار بھی تو وصل پر ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے آپ کی پیدائش سے پہلے ہماری ملاقات
ہو جاتی تو آپ اسی دم پیدا ہو جاتے ــــ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ بالآخر ہماری ملاقات ہو گئی۔ اب آپ
سوچ سمجھ کر بتایئے کہ آپ کو کس پیغام کا انتظار تھا۔ مجھے تو قطعاً یاد نہیں کہ میں آپ کے لیے کیا پیغام
لے کر چلا تھا ــــ جھجکیے نہیں، جو ہے سو بول دیجیے، شاید باقی ساری بات مجھے آپ ہی یاد آ جائے ــــ
کیا؟ ــــ کوئی ایسی بڑی بات نہیں؟ کیا مضائقہ ہے؟ کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ بات تو صرف بات
ہوتی ہے اور صرف کرنے کے لیے ہوتی ہے ــــ آپ کی بیوی کے حمل ٹھہرا ہوا ہے؟ ــــ اور وہ بچے
کی پیدائش کے لیے اپنے ماں باپ کے یہاں گئی ہوئی ہے؟ ــــ اچھا، آپ کو اپنے بچے کی آمد کی خبر
کا انتظار ہے ــــ نہیں، پھر وہ پیغام آپ کے لیے نہیں ــــ شاید آپ کے وارث کے
لیے ہو جس نے ابھی پیدا ہونا ہے۔ ہاں، کوئی وارث ہو تو اچھا ہی ہے مگر آپ اسے وراثت میں کیا دے کر

مر یں گے ؟ اپنی بھوک ؟ — خفا نہیں ہوجیے، جواب دیجیے — لیکن نہیں، پہلے میری بات سُن لیجیے۔ میں ابھی تک اُسے روک کر بیٹھا تھا کہ آپ میں سے کسی کو آپ ہی سوجھ جائے گی اور میرے بولنے کی نوبت نہ آئے گی — بات یہ ہے کہ بھوک سے میرا دم نکلا جا رہا ہے ؟ — تو شاید آپ کی بھوک سے ہی میرا یہ حال ہے — تو جو کچھ بھی ہے لے آیئے، باہم بیٹھ کر بسم اللہ کریں — کیوں ؟ — کیا — کھانے کو کچھ بھی نہیں ؟ — ہہ ہہ ہا — ہا ہہ ! — اسی لیے آپ سب اپنے آپ یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ بھوکوں کو بلائیے نہ بلائیے آپ ہی آپ دُنیا بھر سے چلے آتے ہیں کہ شاید بھوک مٹنے کا سامان ہو جائے اور جہاں سامان ہو جائے وہیں سکونت اختیار کر لیتے ہیں اور بھانت بھانت کی بولیاں بولنے کے باوجود سبھی ہم وطن معلوم ہوتے ہیں — بھوک کا رشتہ بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے صاحبین — بے حساب لوگوں میں اُسی ایک درد اور اضطراب کا رشتہ — ہاں، ماں باپ کا، بھائی بہن کا، بیوی، بچوں کا رشتہ بھی اس رشتہ سے چھوٹا ہے — ٹھہریے میرا خیال ہے میرے ذہن میں وہ پیغام اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائے بے تحاشا چلا آ رہا ہے ہاں، ہاں وہی ہے۔ پوری ایک صدی میرے ذہن کے بے کراں جنگل میں بھٹکتا رہا ! اور اب اچانک وارد ہو گیا ہے — ٹھہریے صاحبین بے صبر نہ ہوجیے۔ ہاں، ہاں یہ پیغام آپ سبھوں کے لیے ہے، نا معلوم کون سی ٹیڑھی میڑھی زبان بول رہا ہے مگر سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ دوام میں کھانے پینے کو کچھ مہیا نہیں ہوتا ؛ جیسے بھی ہو اِسی دُنیا میں اپنی روٹی روزی کی صورت کیجیے۔ السلام علیکم ! آپ بھی آ ئیے۔ ابھی میں نے اپنی داستان شروع نہیں کی —
